ترقی پسند ادب کا ترجمان

انگارے

مرتبہ

سیّد عامر سہیل

ماہانہ کتابی سلسلہ

گیارہویں کتاب

نومبر ۲۰۰۳ء

مراسلت: ۵۴۵/c گل گشت کالونی، ملتان

ای میل: angarey@poetic.com

مطبع: عاتکہ پرنٹنگ پریس، ملتان

قیمت: بیس روپے

ترتیب

۱۔ چند باتیں	سید عامر سہیل	۳
مضامین:		
۲۔ چراغِ آخر شب (ظہیر کاشمیری)	حمایت علی شاعر	۴
۳۔ کچھ وقت رشید امجد کے ساتھ	ڈاکٹر انور سدید	۱۰
۴۔ الف لیلہ و لیلہ	پروفیسر اصغر علی شاہ	۱۴
۵۔ فراق__اپنی نظر میں	ڈاکٹر روبینہ ترین	۲۱
۶۔ ادب اور معروضی حقیقت (جمالیات:۱)	ابنِ حسن	۲۶
۷۔ ڈاکٹر سیّد عبداللہ اور ناول	شوکت نعیم قادری	۳۷
کہانی:		
۸۔ ایکسیڈنٹ (ایرانی کہانی کا اُردو روپ)	سیمین دانشور/رشید قیصرانی	۴۲
۹۔ رحمت کا فرشتہ	رانی آکاش ہاشمی	۵۳
سلسلہ وار ناول:		
۸۔ ایک مرد (قسط ۵)	اوریانا فلاشی/خالد سعید	۵۸
شاعری:		
۹۔ دُکھ محبت کا مقدر بھی تو ہو سکتا ہے	قیوم طاہر	۷۰
۱۰۔ افسوس ایک نان سے سستا چلا گیا	پرویز ساحر	۷۰
۱۱۔ مثالِ عکس، غمِ انعکاس میں رہنا	عطاء الرحمٰن قاضی	۷۱
۱۲۔ کثرت کی طلب میں کھو گئے ہیں	عطاء الرحمٰن قاضی	۷۱
۱۳۔ جی کا آئینہ، صاف کرنے کو	منیر عصری	۷۲
۱۴۔ موت کی نغمہ کاریاں، زندوں کو مارتی رہیں	منیر عصری	۷۲
۱۵۔ احساس (نظم)	شانی فریاد	۷۳
حروفِ زر (قارئین کے خطوط):		
۱۹۔ بنام مرتب		۷۴

سید عامر سہیل

چند باتیں

ہماری ترجیحات خواہ وہ حکومتی سطح پر ہوں یا فرد کی سطح پر ایک خاص انداز سے نہ صرف تبدیل کی گئیں بلکہ بعض ایسے عوامل کو بھی زندگی کے لیے ناگزیر بنا کر پیش کیا گیا جو شاید ایک معاشرے کے عمومی مزاج سے ہٹ کر تھا۔ان اشیاء کو ہماری ناگزیر ضرورت بنانے میں جہاں ذرائع ابلاغ کی کارکردگی کو تعلق ہے وہاں ایک بھیڑ چال کو بھی نہایت اہمیت حاصل ہے۔مثلاً ایک دَور میں تعلیم ،فکر، فن اور سماجی علوم ہماری فکری اور ذہنی بالیدگی کی اوّلین ترجیح ہوا کرتے تھے اور اس کے ساتھ ساتھ سائنس اور ٹیکنالوجی ہماری ضروریات اور تجسّس کے لیے مہمیز کا کام سرانجام دیا کرتی تھی۔مگر اب صورت حال عدم توازن کا شکار ہے۔ہمارے ہاں انفارمیشن ٹیکنالوجی اور کمپیوٹر لٹریسی کو کچھ اس انداز سے پیش کیا گیا ہے کہ شاید یہی ہماری کامیابی، ذہنی بالیدگی، فکری بلندی اور سماجی تعلق کی بہتری کا واحد ذریعہ ہے۔ پھر ہوا یوں کہ انفارمیشن ٹیکنالوجی کو کچھ اس انداز سے ہمارے اور ہماری نسلوں کے لیے ناگزیر بتایا گیا کہ پانچ سالوں کے اندر اندر دو نسلیں تیار ہو کے پروان چڑھیں مگر وہ سماجی ہمواری، فکری بلندی، رواداری اور باہمی تعلق جو کہ تھا اب پہلے سے بھی معدوم نظر آنے لگا ہے۔اس پر طرّہ یہ کہ جگہ جگہ نیٹ کلب، کیفے، گلی کوچوں میں کمپیوٹر ٹریننگ سنٹر، ایک ایک کمرے کا کالج وغیرہ نوجوانوں کے خوابوں پر ''گلیمر'' کے ذریعے نقب لگانے لگے اور وہ مغربی اثرات جنھیں رفتہ رفتہ اس معاشرے کے ساتھ ہم آہنگی پیدا کرنی تھی ایک بے ربط اور اندھی صورت حال کے ساتھ ہماری ذہنی اور ثقافتی اکائی کو توڑنے لگے۔ادھر حکومتی ایجنڈے (جو زیادہ تر مغربی تقلید پر مبنی ہیں) کے تحت عام طلبہ کی توجہ سماجی علوم سے بالکل ہٹ گئی ہے۔

معاشرہ، معاشرتی تعلق، فرد، نئے سماجی رشتے اور تقاضے، تہذیبی تبدیلیاں اور اثرات، نئے معاشرے کی تشکیل وغیرہ کو سمجھنے، پرکھنے اور ان کا تجزیہ کرنے کے لیے ہمارے پاس سماجی علوم کے سائنس دانوں کی شدید کمی ہے۔مغرب نے جہاں صنعتی اور سائنسی علوم میں ترقی کی ہے وہاں سماجی علوم پر اُن کی گرفت اور نظر قابلِ داد ہے مگر ہمارے یہاں ایک بھیڑ چال ہے اور بس۔ معاشرے کو سنوارنے، معاشرتی قدروں کو سمجھنے، نئے معاشرے کی تشکیل کو جاننے اور ایک نئے فکری انقلاب کی طرف بڑھنے کے لیے ہمیں سماجی علوم کو ترقی دینے اور تحقیقی بنیادوں پر استوار کرنے کی اشد ضرورت ہے۔

ہم کب تک اور کتنی تعداد میں ایک زرعی ملک ہوتے ہوئے، ایک ٹوٹے پھوٹے سماجی ڈھانچے کے ساتھ انفارمیشن ٹیکنالوجی کے خود ساختہ پولٹری فارم سے نیم خواندہ برائلر پیدا کرتے رہیں گے............؟؟؟؟؟

حمایت علی شاعر

چراغِ آخرِ شب
(ظہیر کاشمیری)

ترقی پسند ادب کی تحریک کے زیرِ اثر جہاں ہمارے بعض شعراء نے نیا اندازِ فکر اپنایا اور نئے اسالیب اختیار کیے وہاں معاشرے کے باشعور انسانوں کی طرح اپنی ذمہ داری سمجھتے ہوئے باعمل زندگی بھی گذاری۔ وہ انقلاب کے خواب دیکھتے اور اس کی تعبیر کے لیے کوشاں بھی رہتے۔ کچھ شاعروں نے تو متعلقہ سیاسی جماعتوں کی باضابطہ رکنیت بھی حاصل کر لی اور اپنے نظریات کی محبت میں اتنا آگے بڑھ گئے کہ ان کا فن پیچھے رہ گیا۔ ان شعراء پر حکومتِ وقت کا عتاب بھی نازل ہوتا رہا۔ وہ جیلوں میں بند کیے گئے، ان کا روزگار چھینا گیا اور انہوں نے عام قیدیوں کی طرح سخت سزائیں بھی کاٹیں۔

ہمارے پیش رووں میں جن شعراء نے ایسی مجاہدانہ زندگی گزاری، ان میں حیدر آباد دکن کے مخدوم محی الدین کا نام سرِ فہرست ہے (۱۹۰۸ء-۱۹۶۹ء) انہوں نے جامعہ عثمانیہ سے اعلیٰ تعلیم حاصل کی اور ایک کالج میں لیکچرار ہو گئے۔ پھر کمیونسٹ پارٹی سے وابستہ ہو کر مزدوروں میں کام کرنے لگے۔ تلنگانہ تحریک میں حصہ لیا اور باغی کسانوں کی چھاپہ مار تنظیم کے ہَراول دستے میں شامل ہو گئے۔

دوسرے شاعر پرویز شاہدی تھے (۱۹۱۰ء-۱۹۶۸ء) جو بہار میں پیدا ہوئے، اعلیٰ تعلیم پائی اور کلکتہ جا کر مزدور انجمنوں سے وابستہ ہو گئے۔ وہ بھی کمیونسٹ پارٹی کے باضابطہ ممبر رہے۔

تیسرے شاعر علی سردار جعفری ہیں (۱۹۱۳ء) جو یوپی سے اٹھے اور بمبئی جا کر بس گئے۔ بہت پڑھے لکھے، صاحبِ نظر نقاد، انقلابی شاعر اور کمیونسٹ پارٹی کے سرگرم رہنما___ ادب اور سیاست، دونوں محاذوں پر مستقل نبرد آزما رہے۔ چوتھے شاعر ظہیر کاشمیری تھے (۱۹۱۹ء-۱۹۹۴ء) جو پنجاب کے کشمیری خاندان میں پیدا ہوئے، نہایت بیباک، باشعور اور بلند آہنگ شاعر، صحافی اور نقاد___ ساری عمر کشمیر ہی کی نسبت سے پہچانے گئے۔

ان شعراء نے مستقبل کے اہلِ قلم کو بھی راستہ دکھایا چنانچہ ہمارے ہم عصروں میں حبیب جالب اور حسن حمیدی کے نام اس مجاہدانہ زندگی کی روشن مثالیں ہیں۔

بعض ناقدین کا خیال ہے کہ اگر یہ شعراء صرف شاعری کرتے اور اپنی صرف ایک ہی پہچان رکھتے تو شاید عہدِ حاضر کے بہت بڑے شاعر ہوتے اور تاریخ ادب میں ہمیشہ زندہ رہتے کیونکہ ان میں بڑی شاعری کے سارے امکانات موجود تھے___ ممکن ہے یہ خیال درست ہو، ویسے جہاں تک زندہ رہنے کی بات ہے، میرا خیال ہے اُن کا ایک ایک شعر ہی انہیں زندہ رکھنے کے لیے کافی ہے۔

حیات لے کے چلو ، کائنات لے کے چلو
چلو تو سارے زمانے کو ساتھ لے کے چلو (مخدوم)

ہم نے جا کر دیکھ لیا ہے، حدِ نظر سے آگے بھی
راہگذر ہی راہگذر ہے ، راہگذر سے آگے بھی (پرویز شاہدی)

دامن جھٹک کر منزل غم سے گزر گیا
اٹھ اٹھ کے دیکھتی رہی گرد سفر مجھے (سردار جعفری)

اور ظہیر کاشمیری نے تو ایسا شعر کہہ دیا جو ہر دور کے جذبۂ یقین کی ضمانت ہے۔

ہمیں خبر ہے کہ ہم ہیں چراغِ آخر شب
ہمارے بعد اندھیرا نہیں ، اجالا ہے

ظاہر ہے کہ یہ تمام اشعار ایک مخصوص نظریہ حیات کی عطا ہیں۔ حیات و کائنات کے بارے میں کارل مارکس نے جدلیاتی مادّیت کی روشنی میں ہمارے عہد کو تاریخ کا جو شعور دیا اور معاشی مساوات کی بنیاد پر جس ہمہ گیری انقلاب کی بشارت دی، دنیا کے ہر اہل نظر نے اس سے اپنے افکار کو اجالا ہے۔ اردو شاعری میں علامہ اقبال نے پہلی بار اس روشنی کو عام کیا اور اپنے کلام کی وساطت سے پوری صدی کو جگمگا دیا۔

آفتاب تازہ پیدا بطن گیتی سے ہوا
آسماں ڈوبے ہوئے تاروں کا ماتم کب تک

اپنے ملک میں انقلاب کا خواب دیکھنے والے شعراء اسی آفتاب تازہ کے اجالے میں سفرِ حیات طے کر رہے ہیں۔ ظہیر کاشمیری بھی انہیں کے ہم رکاب تھے۔

اُن کا نام غلام دستگیر تھا۔ وہ ۲۱/اگست ۱۹۱۹ء کو پیدا ہوئے (نقوش کے ''غزل نمبر'' میں ان کا سنہ پیدائش درست نہیں) ایم۔اے۔او کالج امرتسر سے بی۔اے کیا، ۴۳ء میں ایم۔اے (انگریزی ادبیات) کے دوران، سیاسی سرگرمیوں کی بنا پر تعلیم کا سلسلہ منقطع ہو گیا۔

ظہیر کاشمیری کی سیاسی زندگی کا آغاز، زمانہ طالب علمی ہی سے ہو چکا تھا۔ وہ اپنے کالج میگزین ''الہلال'' کے مدیر تھے جس میں انہوں نے سامراجی نظام کے خلاف ایک سخت مضمون لکھ دیا، ان کی جواب طلبی ہوئی اور رسالہ ضبط کر لیا گیا۔ ۴۰ء میں جب وہ پنجاب سٹوڈنٹ فیڈریشن کے صدر تھے، اپنے ضلع میں فرینڈز آف سوویت یونین کے عہدہ دار بھی رہے۔ دوسری جنگ عظیم کے دوران ترن تارن کانفرنس (۴۱ء) میں برٹش آرمی میں بھرتی کے خلاف تقریر کے جرم میں، زیر دفعہ (۳۸) ڈیفنس آف انڈیا رولز کے تحت انہیں گرفتار کر لیا گیا اور نو ماہ قید با مشقت کی سزا سنائی گئی۔ یہ وہ دور تھا جب حفیظ جالندھری حکومت

کے پبلسٹی ڈیپارٹمنٹ میں فوجی ملازمت کی ترغیب کے سلسلے میں گیت لکھنے پر مامور تھے۔ ان کا مشہور گیت

''میں تو چھورے کو بھرتی کرائی آئی رے''

انہیں دنوں کی یادگار ہے۔

ظہیر کاشمیری ایک جادو بیاں اور جوشیلے مقرر بھی تھے، کالج کے تقریری مقابلوں میں اکثر نمایاں کامیابی حاصل کرتے، اس سلسلے میں انہیں لاہور کے علاوہ علی گڑھ یونیورسٹی سے بھی انعامات ملے۔

۴۲ء میں ظہیر کاشمیری کو ڈسٹرکٹ ٹریڈ یونین کانگریس کا سکریٹری چنا گیا، پھر صدر منتخب کر لیا گیا۔ ۴۳ء اور ۴۴ء میں جب ان کی سرگرمیاں بہت بڑھ چکی تھیں اور حکومت مختلف الزامات کے تحت انہیں پورے زمانہ جنگ کے لیے قید کر دینا چاہتی تھی ___ وہ روپوش ہو گئے۔ یہ زمانہ ظہیر صاحب نے ٹاٹا نگر اور کلکتہ میں گزارا۔ وہیں ایک مشاعرے میں اُن کی ملاقات مجروح سلطان پوری اور دوسرے ترقی پسند شعراء سے ہوئی۔ ۴۵ء میں جب حالات قدرے بہتر ہوئے تو وہ لاہور آ گئے مگر دفعہ (۱۴۴) توڑنے کے جرم میں انہیں پھر گرفتار کر لیا گیا۔

سیاسی مصروفیات کے ساتھ ساتھ ظہیر کاشمیری ادبی کاموں کے لیے بھی وقت نکالتے رہتے۔ اسی دوران انہوں نے بعض فلموں کے لیے نغمات بھی لکھے۔ ۴۲ء میں ''راگنی'' ۴۴ء میں ''پردیسی بالم'' اور ۴۵ء میں ''بسنت پنچھی'' کے گیت لکھے۔ انہیں برسوں میں یعنی ۴۵ء، ۴۶ء اور ۴۸ء میں شائع ہونے والے شعری ادب کی انتھالوجی بھی مرتب کی اور ترقی پسند ادب کے ترجمان سہ ماہی ''سویرا'' کی ادارت کے فرائض بھی انجام دیئے۔ قیام پاکستان کے بعد بھی انہوں نے کئی فلموں کے نغمات، مکالمے اور اسکرین پلے تحریر کیے جن میں ''خون ناحق''، ''انجام''، ''اندھی محبت''، ''آس پاس'' اور ''فرض'' وغیرہ نمایاں ہیں۔ ظہیر کاشمیری نے ایک پنجابی فلم ''ڈیرہ سجناں دا'' کے گیت بھی لکھے ہیں۔ وہ کبھی کبھی پنجابی میں شعر بھی کہتے تھے جو ان کی کتاب ''رقصِ جنوں'' میں شامل ہیں۔

۱۹۴۸-۴۹ء کے دوران، لاہور میں پہلی کل پاکستان ترقی پسند مصنفین کانفرنس منعقد ہوئی جس میں روسی ادیبوں کے وفد نے بھی شرکت کی تھی۔ ظہیر کاشمیری نے اپنے رفقاء احمد راہی اور عارف عبدالمتین کے ساتھ مل کر ''سویرا'' کا کانفرنس نمبر شائع کیا جس میں امریکہ، برطانیہ، فرانس اور ہندوستان کے اہلِ قلم کے پیغامات، روسی ادیبوں کا تعارف اور مرزا ترسوں زادہ کے فارسی کلام کے علاوہ کانفرنس کا منشور، چراغ حسن حسرت کا خطبہ استقبالیہ اور ظہیر کاشمیری کا مقالہ ''جمہوریہ روس کا قومی ادب'' بھی شامل ہے۔ مزید برآں ۱۴/۱۱/اپریل ۱۹۵۰ء کو اوکاڑہ میں ہونے والی عالمی امن کانفرنس کی روداد بھی شائع کی گئی ہے۔

یہ وہ زمانہ تھا جب حکومت پاکستان نے ترقی پسند مصنفین کی انجمن کو ایک سیاسی جماعت قرار دے دیا تھا۔ آئے دن انجمن کے دفتر اور اراکین کے مکانوں کی تلاشیاں لی جاتیں، کئی اہلِ قلم کو گرفتار بھی کیا گیا اور ایک سنگین واقعہ یہ پیش آیا کہ عالمی امن کانفرنس کے دوران ظہیر کاشمیری پر قاتلانہ حملہ ہوا جس

میں وہ تو بچ گئے مگر حملہ آور گرفتار نہ ہو سکا۔ اس واقعے اور حکومت کی مجموعی پالیسی کے خلاف ظہیر صاحب نے ''سویرا'' (۵-۶) میں نہایت سخت اداریہ لکھا جس کی بناء پر اسے چھ ماہ کے لیے بند کر دیا گیا۔ اس کے بعد کے شمارہ نمبر (۷-۸) کی اشاعت کے وقت بھی حکومت نے چھ ہزار روپے کی ضمانت طلب کی اور ظہیر کاشمیری کو سیفٹی ایکٹ کے تحت چھ ماہ کے لیے نظر بند کر دیا گیا۔

۵۳ء میں بھی جب انہوں نے سائنٹفک کمیونسٹ بلاک آف پاکستان کی تشکیل میں حصہ لیا تو پھر گرفتار ہوئے اور قید و بند کا یہ سلسلہ عرصہ دراز تک چلتا رہا۔ انہوں نے قید بامشقت کی سزا بھی کاٹی مگر حکومتِ وقت سے کبھی سمجھوتہ نہیں کیا۔ اپنے نقطہ نظر سے متعلق نہ صرف شاعری کرتے رہے بلکہ مختلف اخبارات میں بیباکانہ کالم بھی لکھتے رہے۔ روزنامہ احسان، حالات، نوائے وقت اور پکار وغیرہ میں ان کی یہ تحریریں محفوظ ہیں۔ ان کے مطالعے سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ ملکی اور قومی مسائل کے علاوہ دنیا کے مسائل سے بھی کس قدر آگاہ تھے۔ ان کی نظموں کے موضوعات بھی اس حقیقت کی گواہی دیتے ہیں کہ عالمی سیاسی حالات پر پاکستان میں سب سے زیادہ ظہیر کاشمیری نے لکھا ہے۔ بین الاقوامی موضوعات پر ان کی قابلِ ذکر نظمیں حسبِ ذیل ہیں۔

الجزائر، جمیلہ، سوئیز، فلسطین، انقلاب روس، دوسری عالمگیر جنگ، میں ہنگری کا فرزند ہوں، ستارہ شناس، اہرام، چراغ، بین الاقوامیت، تخت و الہام، قانون، میڈیم فی فی اور ان کی طویل نظم ایشیا وغیرہ۔ ملکی اور قومی مسائل پر بھی ظہیر کاشمیری نے بڑی فکر انگیز شاعری کی ہے۔ عورت، تقدیر، ادب برائے ادب، آزادی، خواب سحر، فرد اور سیاست، منشورنو، عوام، طاقت سرچشمہ، ۱۸۵۷ء، روشنیوں کا شہر، مصلوب آدمی اور جلاوطن وغیرہ۔ ظہیر کاشمیری نے طویل نظمیں بھی لکھی ہیں اور ان میں انسان کے ارتقاء کی داستان اور اس کے مسائل کا تجزیہ، تاریخ کے مادی نظریات کی روشنی میں کیا ہے۔ خاص طور سے ''آدمی نامہ'' جس میں اس آدمی کی تصویر پیش کی گئی ہے جو نظیر اکبر آبادی کے ''آدمی'' سے بہت مختلف ہے۔ نظیر کا آدمی سب کچھ ہوتے ہوئے بھی مجبورِ محض تھا۔ ظہیر کاشمیری کا آدمی، علامہ اقبال کا ''مردِ مومن'' تو نہیں لیکن اپنی دنیا آپ پیدا کر رہا ہے۔ ان کی دوسری طویل نظمیں، چاند اور ایشیا بھی ان کی سیاسی بصیرت اور تاریخ آگاہی کی روشن مثالیں ہیں۔

ظہیر کاشمیری کی لفظیات بھی ہمیں ان کی وسعت فکر، ندرتِ خیال اور جدتِ اظہار کا آئینہ دکھاتی ہیں۔ وہ نت نئی تراکیب تراشتے ہیں، کہیں کہیں تو یہ محسوس ہوتا ہے کہ وہ ہمارے دور کے ناسخ ہیں، اگر میں ان کی شعری لغات سے بحث کروں تو بات دور تک چلی جائے گی مگر یہ خاص نکتہ ہے جسے نظر میں رکھ کر ان کی شاعری کا تجزیہ کیا جا سکتا ہے۔

یہ مسئلہ دراصل ہر ''صاحبِ علم'' شاعر کا مسئلہ ہوتا ہے۔ ناسخ اور غالب اپنے ''علم'' کی دنیا رکھتے تھے۔ اقبال، جوش، فیض، ندیم اور ظہیر کاشمیری اپنا علمی پسِ منظر رکھتے ہیں۔ اسی طرح ہمارے ہم

عصروں میں عزیز حامد مدنی، ڈاکٹر وزیر آغا اور عبدالعزیز خالد کا نام بھی لیا جا سکتا ہے۔ ان تمام شعراء نے یا تو روائتی الفاظ کو نئی معنویت دی ہے یا نئی تراکیب اختراع کر کے اپنے فکر و شعور کی نئی صورت گری کی ہے۔ اس کے علاوہ ان شعراء نے شعری ضرورت کے تحت ان الفاظ سے بھی مدد لی ہے۔ جو شاعری کی لغات میں شامل نہیں تھے۔ ظاہر ہے کہ یہ اجتہاد بعض روایت پسند حضرات پر گراں گزرتا ہے چنانچہ وہ ایسی شاعری کو صحافتی، خارجی یا ناشاعری وغیرہ کہہ کر نظر انداز کر جاتے ہیں۔ یہ درست ہے کہ ان شعراء کی مسائلی، سیاسی اور سائنسی موضوعات پر لکھی ہوئی بعض نظمیں، شاعری کے مروّجہ معیار پر پوری نہیں اترتیں لیکن وہ حضرات یہ بھول جاتے ہیں کہ اجتہاد میں ایسے مقامات تو آتے ہی ہیں۔ ہر اجتہاد، تجرباتی ہوتا ہے۔ علامہ اقبال پر بھی روائتی دبستان شاعری کی طرف سے ایسے ہی اعتراضات کئے گئے تھے۔ مگر پھر

تھا جو ناخوب ، بتدریج وہی خوب ہوا

ظہیر کاشمیری کی مقبولیت میں ان کی شعری لفظیات کے علاوہ ان کے نظریات بھی حائل رہے۔ وہ اشتراکی ہی نہیں کٹّر مارکسٹ بھی تھے۔ وہ اپنے ہم عصروں کے مقابلے میں زیادہ ''راست گو'' تھے۔ مخدوم، پرویز شاہدی اور سردار جعفری کی طرح ان کا اسلوب شعر بھی بیانیہ تھا۔ تنقید میں بھی وہ سردار جعفری کی طرح بلند آہنگ نظر آتے ہیں۔ ان کے فکر انگیز اور خرد افروز مضامین کا مجموعہ ''ادب کے مادّی نظریے'' ان کے مزاج اور ان کی طرزِ فکر کے آئینہ دار ہیں۔ اس کتاب کے علاوہ بھی ان کے کئی مضامین قابلِ مطالعہ ہیں۔ جدیدیت پسند شعراء کے بارے میں ان کا مقالہ ''اردو کے ٹیڈی شاعر'' اور روایت میں جدّت پسندی کے موضوعات پر ان کے مباحث دعوت فکر دیتے ہیں۔

ادب کی اس سنجیدہ فضا سے ہٹ کر ظہیر کاشمیری نے ریڈیو اور ٹیلی ویژن کے لیے ڈرامے بھی لکھے۔ جیسا کہ میں نے پہلے لکھا ہے کہ متعدد فلموں کے مکالمے اور اسکرین پلے بھی تحریر کیے۔ ۵۶ء میں ''تین پھول'' کے نام سے ایک فلم بھی ڈائریکٹ کی۔ سیاسی اور صحافتی حوالے سے بھی وہ جمہوری تحریکات میں پیش پیش رہے چنانچہ ۸۲ء میں بھی انہیں مارشل لاء کے تحت قید و بند کی صعوبتیں برداشت کرنا پڑیں۔ اس دور میں وہ روزنامہ ''مساوات'' کے ایڈیٹر تھے۔

ظہیر کاشمیری کی نثر ہو یا نظم ــــ حتیٰ کہ ان کی غزل بھی اپنا ایک مخصوص لہجہ رکھتی ہے۔ ان کے ہر شعر سے ان کا مزاج اور ان کا کردار جھلکتا ہے۔ غزلوں کے چند اشعار ملاحظہ کیجیے۔

جاؤ کہہ دو کوئی ساحل کے شبستانوں میں
لنگر انداز ہوں میں آج بھی طوفانوں میں

میں ہوں وحشت میں گم، میں تیری دنیا میں نہیں رہتا
بگولہ رقص میں رہتا ہے ، صحرا میں نہیں رہتا

بہت اچھا ہوا مجھ کو درِ قاتل پہ لے آئے
مجھے منزل پہ آنا تھا ، مجھے منزل پہ لے آئے

دارورسن تعلق خاطر کی بات ہے
ورنہ قریب تر تھا شبستان کھلا ہوا

مجھ پر ہیں ختم ، عرصۂ شب کی صعوبتیں
اک صبح نود میدہ کی پہلی کرن ہوں میں

ان کی جانب سے اذنِ سخن جب ملا، سب غرورِ سخن کا بھرم کھل گیا
گیت ہونٹوں پہ آتے ہی پتھر بنے، اک غزل تھی سو وہ بے زباں ہوگئی

ظہیر کاشمیری کے پانچ شعری مجموعے ہیں۔عظمتِ آدم، تغزل، چراغِ آخرشب، رقصِ جنوں اور آدمی نامہ- حال ہی میں، ''عشق اور انقلاب'' کے نام سے ان کے کلیات کی اشاعت کا اعلان ہوا ہے۔ نئے مضامین کا مجموعہ ''جہانِ آگہی'' بھی زیرِ طبع ہے۔

ظہیر صاحب کا انتقال ۱۲/ دسمبر ۱۹۹۴ء کو ہوا جب ان کی عمر (۷۵) سال ہو چکی تھی۔ اس دوران میں دو رسائل- ماہنامہ ''شام وسحر'' (لاہور) نے ۸۸ء میں اور ماہنامہ ''طلوعِ افکار'' (کراچی) نے ۸۹ء میں ان کی شاعری اور شخصیت کے بارے میں دو گوشے شائع کیے۔ جن میں کچھ نئے اور دو ایک معروف ادیبوں کے مختصر مضامین اور تاثرات اور دو انٹرویو شامل ہیں۔ ظہیر کاشمیری کے ادبی مرتبے اور ان کی خدمات کے بارے میں کسی سکہ بند ناقد نے کبھی کوئی مبسوط مقالہ نہیں لکھا۔ ان کے خاندان اور ان کی زندگی کے حوالے سے ادب کے طالب علموں کی معلومات بہت محدود ہیں۔ شاید اس کا سبب یہ ہو کہ انہوں نے اپنی تشہیر کا عمومی رویہ کبھی اختیار نہیں کیا۔ اپنا کوئی ادبی حلقہ نہیں بنایا، وہ لاہور جیسے شہر میں رہنے کے باوجود ''اپنوں میں اجنبی'' رہے۔ وہ جانتے تھے کہ علم وادب کی دنیا میں یہ لمحاتی اور وقتی ظاہر داریاں کوئی معنی نہیں رکھتیں۔ انہیں احساس تھا کہ اس نمائشی ہجوم میں کوئی کسی کا نہیں ہوتا۔ انتقال سے کچھ عرصہ قبل انہوں نے جو ''گیت'' لکھا تھا، وہ اسی کیفیت کا آئینہ ہے۔ اس گیت نما نظم کا آخری بند ہے:

تو جو زندہ تھا تو زندہ تھی حیات و کائنات
چاہتیں ، رنگیں ملاقاتیں ، انوکھے حادثات
کیا یہی تجھ کو ملا ، ذوقِ محبت کا صلہ
آج تیری موت پر اک آنکھ بھی روئی نہیں
اے دلِ تنہا ، ترا کوئی نہیں

ڈاکٹر انور سدید

کچھ وقت رشید امجد کے ساتھ

میں رشید امجد کا شمار اُردو کے ان جدید افسانہ نگاروں میں کرتا ہوں جنہوں نے روایتی نقاد کا آسرا لینے اور اس کی چلمیں بھر کر اپنی تعریف وتحسین میں مضامین لکھوانے کی بجائے اپنا ایک دبستان فن پیدا کیا۔ یہ دبستان نہ صرف اپنے انداز اور اپنے اُسلوب کے افسانے لکھ رہا تھا بلکہ اپنے فن کی وکالت کے لیے نقاد کا فریضہ بھی خود انجام دے رہا تھا۔ رشید امجد کی ادبی زندگی کا یہ واقعہ بہت اہم ہے کہ اُردو ادب کے نامور نقاد اور ''شب خون'' الہ آباد کے مدیر شمس الرحمٰن فاروقی نے اسلام آباد میں قدم رنجہ فرمایا اور رشید امجد اپنے دوست منشا یاد اور احمد جاوید کے ساتھ انہیں ملنے گئے تو انہوں نے فاروقی صاحب سے شکایت کی: ''آپ نے جدید افسانے کو صرف ایک نسل تک دیکھا ہے، اس سے بعد والے لوگ بھی آپ کی توجہ چاہتے ہیں۔'' شمس الرحمٰن فاروقی ہنس پڑے اور بولے ''میں کیوں لکھوں، آپ اپنا نقاد خود پیدا کریں۔''

فاروقی صاحب کی بات درست تھی۔ ۱۹۳۶ء میں ترقی پسند تحریک اپنی سیاست کا تام جھام لے کر اُردو ادب میں وارد ہوئی تو اس نے ایک اہم کام یہ کیا کہ اس دور کے نقادوں پر انحصار کرنے کی بجائے اپنے فن کے نقاد بھی اس تحریک کے اندر سے پیدا کیے اور حقیقت یہ ہے کہ علی سردار جعفری، سید احتشام حسین، وقار عظیم، اختر حسین رائے پوری، احمد علی، سجاد ظہیر، ڈاکٹر عبدالعلیم، مجنوں گورکھ پوری، ممتاز حسین اور عبادت بریلوی جیسے نقاد اگر اس تحریک کے ادیبوں کا تعارف فنی اور نظریاتی سطح پر نہ کراتے تو اس کی ترقی کا گراف بلند نہ ہوتا اور اس کے سیاسی اور ادبی زاویے شاید آدرش کا درجہ اختیار نہ کرتے۔

رشید امجد کے لیے شمس الرحمٰن فاروقی کی ''نصیحت'' بروقت نہیں تھی، کیونکہ وہ اس سے بہت عرصہ پہلے اس کام کا آغاز اس وقت خود کر چکے تھے جب انہوں نے راولپنڈی میں ''لکھنے والوں کی انجمن'' بنائی اور اس میں اس دور کے چند نئے تخلیقی اذہان، کو جمع کر لیا تھا جن میں اعجاز راہی، رشید نثار، شبنم مناوری، نثار ناسک، سلیم الظفر، بشیر سیفی، سرور کامران اور متعدد دوسرے نئے ادبا شامل تھے۔ انہوں نے اس انجمن کے نہ صرف باقاعدہ اجلاس منعقد کرنے شروع کر دیئے بلکہ اپنا ربط وتعلق ڈاکٹر وزیر آغا سے بھی قائم کیا جن کی تنقید کی کتاب ''اُردو شاعری کا مزاج'' متنازعہ قرار دی جا چکی تھی، اس وقت مولانا صلاح الدین احمد وفات پا چکے تھے اور وزیر آغا اپنا رسالہ ''اوراق'' جاری کر چکے تھے، رشید امجد اور ان کے ساتھی اس نئے پرچے کے آغاز میں ہی اس میں چھپنے لگے تو دوسرے مقبول رسائل کی طرف اپنی ''اڑان'' کو غیر ضروری قرار دیا اور ''اوراق'' سے اب تک اپنا سلسلہ برقرار رکھا ہوا ہے۔

''نئے لکھنے والوں کی انجمن'' کے ارکان نے دوسرا اہم کام یہ کیا کہ اس دور کی معروف ادبی انجمن ''حلقہ اربابِ ذوق'' کے جلسوں میں نہ صرف شرکت شروع کردی بلکہ فن پارے کی بحث کے دوران وہ سینئر ادباء پر ''حملہ زن'' بھی ہونے لگے۔ اپنی یادداشتوں کی کتاب ''تمنا بے تاب'' میں رشید امجد نے لکھا۔ (''حلقہ اربابِ ذوق'' کے) اجلاس کے دوران بھی صدر کی کوشش ہوتی کہ ہمیں (نئے لکھنے والوں کی انجمن کے ارکان کو) جہاں تک ممکن ہو نظر انداز کریں۔ ایک بار ضیاء جالندھری آئے ہوئے تھے۔ کسی نظم پر گفتگو ہو رہی تھی۔ سرور کامران نے کئی دفعہ بولنے کی کوشش کی لیکن صدر کسی اور کی طرف اشارہ کر دیتے۔ ضیاء جالندھری نے بھی بات کی۔ سرور کامران بولنے لگے تو صدر نے کہا: ''میرا خیال ہے کہ ضیاء صاحب کے بعد اب اس موضوع پر بات کرنے کی گنجائش نہیں۔'' سرور کامران نے کہا: ''اگر ضیاء صاحب کے بعد انسانی پیدائش رک گئی ہے، تو پھر ٹھیک ہے۔''

رشید امجد کے دوستوں نے تشدد کا ایسا رویہ اختیار کر لیا کہ حلقہ اربابِ ذوق کے سینئر ارکان نہ صرف ان سے خوف کھانے لگے بلکہ ان کے اُٹھائے ہوئے تنقیدی نکات کو اپنی کارروائیوں کی روداد میں شامل بھی کرنے لگے، ان کے وجود اور موجودگی کا اعتراف ہونے لگا۔ رشید امجد نے اس طریقہ واردات کا تذکرہ ان الفاظ میں کیا ہے: ''ہم سات آٹھ لوگ ایک ساتھ اندر داخل ہوتے اور جو چیز پڑھی جاتی اس پر اتنی تنقید کرتے کہ پڑھنے والا قسم کھا کے جاتا کہ دوبارہ حلقے میں نہیں آئے گا۔''

ان نوجوانوں کا یہ باغیانہ رویہ درحقیقت سینئر لکھنے والوں کی کاذب انا کی جھوٹی نمائش اور خودستائشی کے خلاف تھا اور اس کا داخلی زاویہ بے حد مثبت اور ادبی معاشرے کے لیے بہت مفید تھا، لیکن سینئر ادباء اس کی تاب نہ لاتے اور ناراض ہو جاتے۔ ایک واقعہ ممتاز شاعر فیضی (جالندھری) کے بارے میں یوں ہے:

ایک بار سیّد فیضی نے غالب پر نظم پیش کی۔ نظم پڑھنے سے پہلے اُنہوں نے شاعرانہ تعلّی کا مظاہرہ کیا اور کہہ دیا کہ ''اس نظم کو سن کر غالب بھی پھڑک اُٹھے گا۔'' غالب تو کیا پھڑکتے لیکن ہم لوگوں نے سیّد فیضی کو ایسا پھڑکایا کہ وہ آدھے جلسے میں ہی غصے سے کھڑے ہوئے اور کہنے لگے ''......میں فلاں ہوں اگر دوبارہ جلسے میں آؤں۔''

اس تفصیل کو پیش کرنے کا مقصد یہ ظاہر کرنا ہے کہ اُردو افسانے میں بیسویں صدی کی ساتویں دہائی میں رسالہ ''اوراق'' کے اجراء کے بعد تجریدی اور علامتی افسانے کی تحریک شروع ہوئی اور اس نوع کے افسانے میں رشید امجد نے راولپنڈی گروپ کے تخلیق کاروں کو شامل کیا، تو انہوں نے قریباً وہی حربے استعمال کیے جو ۱۹۳۶ء کی تحریک میں ترقی پسند ادیبوں نے سجاد ظہیر کی قیادت میں کامیابی سے برتے تھے، اس نوع کے حربوں کو آزادی کے بعد لاہور میں ''نئی نسل'' کا پرچم بلند کرنے کے لیے ناصر کاظمی اور انتظار حسین نے بھی استعمال کیا تھا اور نئی لسانی تشکیلات کی تحریک شروع ہوئی تو افتخار جالب، جیلانی کامران،

عباس اطہر اور انیس ناگی نے بھی اپنی تحریک کو انہی خطوط پر چلایا یعنی وہ تحریک کے فعال تخلیق کار بھی تھے اور اس کے نقاد بھی۔ رشید امجد کی اس خوبی کا اعتراف ضروری ہے کہ ان کی گفتگو منطقی اور استدلالی ہوتی، وہ آج کے نوجوانوں کی طرح زبانی باتیں نہ کرتے بلکہ مطالعہ ''اپ ٹو ڈیٹ'' رکھتے، کلاسیکی ادب کا گہرائی سے مطالعہ کرتے اور تازہ رسالہ یا کتاب ورق ورق نہ صرف خود پڑھتے بلکہ شام کی محفلوں میں، جو کبھی شالیمار میں، کبھی وگیز میں اور کبھی ''داتا'' ریستوران میں منعقد ہوتیں، تفصیلی گفتگو بھی کرتے اور حلقے میں اتنی مدلل گفتگو کرتے کہ اعتراض کی گنجائش نہ رہتی۔ میرا خیال ہے کہ رشید امجد نے یہ عملی طریق بھی ڈاکٹر وزیر آغا سے اکتساب کیا تھا جن کے بارے میں انہوں نے لکھا: ''وزیر آغا سے جب بھی ملاقات ہوتی، لطف آجاتا...... ہر بار جب ملتے تو میں پوچھتا، آغا صاحب! اس دوران آپ نے کیا پڑھا ہے...... آغا صاحب شروع ہو جاتے اور احساس بھی نہ ہوتا کہ کتنا وقت گزر گیا ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ ان جتنا صاحب مطالعہ ادیب ہمارے عہد میں کوئی دوسرا نہیں ہے۔''

دلچسپ بات یہ ہے کہ اپنی خودنوشت (تمنا بے تاب) کے اس مقام پر رشید امجد نے حالیہ دور میں اُردو ادب کے دوسرے کیمپ کو بھی نظر انداز نہیں کیا اور اس کے ایک سرخیل کے بارے میں لکھا: ''......صاحب سے میرا گہرا تعلق کبھی نہیں رہا۔ میں اس گروپ کے پرچے میں ایک عرصے تک باقاعدگی سے چھپتا رہا، لیکن اس گروپ میں رچ بس نہیں سکا......صاحب سے کئی ملاقاتیں ہوئیں، دو بار فتح محمد ملک صاحب کے گھر دیر تک ادبی منظر نامہ اور ادبی سیاست پر بات ہوئی لیکن انہوں نے اپنی گفتگو میں کبھی متاثر نہیں کیا۔ ان کے منہ سے لطیفے ہی اچھے لگتے ہیں۔ علمی بات کم ہی سنی۔''

اور واقعہ یہ ہے کہ پاکستان کی ادبی دنیا میں دو گروپ لمبے عرصے سے قائم ہیں حالاں کہ ان گروپوں کے ''بڑے'' ان کی موجودگی سے انکار کرتے ہیں۔ ایک گروپ مخصوص مقاصد کی گروہی سیاست میں کامیاب اور سازشوں اور سفارشوں سے سرکار دربار سے انعام و اکرام حاصل کرنے میں مشاق ہے۔ جذبے کے زور پر اس گروہ کے ارکان شاعری بھی کر لیتے ہیں لیکن علمی اور فکری لحاظ سے یہ گروپ کوتاہ نظر ہے، دوسرے گروپ نے تخلیقی، تنقیدی اور تحقیقی سوچ کو اپنے دوستوں کے پڑھے لکھے طبقے میں پروان چڑھایا اور تنقید، افسانہ، شاعری اور انشائیہ میں اپنا ایک جدید دبستان پیدا کیا۔

رشید امجد نے ادیبوں میں سے ڈاکٹر وزیر آغا صاحب کی خوبیوں کا اعتراف کیا ہے اور ایک جگہ لکھا ہے کہ ''وزیر آغا سے میری قربت تھی......سب جانتے تھے کہ میں ان کے قریبی دوستوں میں شامل ہوں۔''

واقعہ یہ ہے کہ پی ایچ ڈی کرنے کا مشورہ بھی رشید امجد کو انہوں نے ہی دیا تھا۔ مشتاق قمر کو ''میراجی'' اور رشید امجد کو ''اُسلوبیات'' کا موضوع بھی انہی کی مساعی سے ملا تھا، لیکن بعد میں مشتاق قمر اپنا مقالہ نہ لکھ سکے تو رشید امجد نے ''میراجی'' کے موضوع پر ڈاکٹر خواجہ محمد زکریا کی نگرانی میں پی ایچ ڈی کا

مقالہ مکمل کیا اور ڈگری حاصل کی جو تحقیق کے اعتبار سے اپنی نظیر آپ ہے۔

ڈاکٹر رشید امجد کی کتاب ''تمنا بے تاب'' ان کی یادوں کا مجموعہ ہے جس میں ارادوں کی بلندی اور تمنا کی بے تابی زیادہ نظر آتی ہے اور اسے پڑھتے ہوئے یوں محسوس ہوتا ہے کہ ہم رشید امجد کی خلوت میں داخل ہو گئے ہیں جو ایک انجمن سے کم نہیں اور اپنا وقت ان کے ساتھ ان کی انجمن میں گزار رہے ہیں۔

☆☆☆

پروفیسر اصغر علی شاہ

الف لیلہ ولیلہ

ڈاکٹر رینالڈ اے نکلس نے اپنی کتاب ''اے لٹریری ہسٹری آف دی عربز'' میں بغیر کسی دلیل اور حوالہ کے لکھا ہے کہ بادشاہوں میں سکندر اعظم پہلا شخص ہے جس نے کہانیاں سنانے کے لیے ملازم رکھے ہوئے تھے۔ وہ اُسے ہنسانے اور اس کی توجہ کو دوسرے معاملات سے ہٹانے کے لیے رات کے وقت کہانیاں سناتے تھے، سکندر کو ان کہانیوں سے خوش ہونے کی نسبت یاد رکھنے سے زیادہ دلچسپی تھی۔ لیکن یہ ایک مفروضہ ہے جو یورپ والے اپنے آپ کو ہر طرح سے برتر ثابت کرنے کے لیے وضع کر لیتے ہیں۔ چنانچہ آگے چل کر ڈاکٹر موصوف نے لکھا ہے کہ 956ء مسعودی نے اپنی کتاب مروج الذہب معادن الجوہر میں (متوفی 956ء) ایک ایرانی ہزار افسانہ کا ذکر کیا ہے۔ جسے عام طور پر ہزار اور ایک رات کہا جاتا ہے۔ ایک بادشاہ شہریار اس کے وزیر کی بیٹی شہرزاد اور اس کی کنیز کی کہانی ہے۔ الفہرست کے مصنف ابن ندیم (متوفی 988ء) اپنی اس کتاب میں ایک باب قائم کیا ہے۔ ''حکایات بیان کرنے والے خرافات گھڑنے والے اور ان کی کتابوں کے نام کو اس نے اس طرح شروع کیا ہے۔ اوّل اوّل جنہوں نے کہانیاں گھڑیں۔ ان کہانیوں کی کتابیں تحریر کیں۔ انہیں اپنے خزانوں میں رکھا۔ ان کہانیوں میں جانوروں کو انسانوں کی طرح بولتے دکھایا۔ قدیم ایرانی بادشاہوں کے لیے کہانیاں بیان کرنے والے اور انہیں اکٹھا کرنے والے ایرانی تھے۔ ان کے بعد پارتھی بادشاہوں نے جو فارس کے بادشاہوں کا تیسرا خاندان ہے اس فن میں بہت تشویق کا اظہار کیا اور کتابیں لکھوائیں۔ پھر ساسانیوں کے عہد میں اس طرح کی کتابیں بہت سی ہو گئیں۔ عربوں نے انہیں عربی زبان میں ترجمہ کیا۔ پھر یہ کتابیں لغت کے ماہرین اور فصیح زبان لکھنے والوں کے ہاتھ آ گئیں۔ تو انہوں نے ان کی زبان کو درست کیا اور اسی طرز پر اور کتابیں لکھیں۔ سب سے پہلی کتاب جو اس شکل میں دستیاب ہوئی۔ وہ ہزار افسان تھی۔ اس کی ابتداء اس طرح ہے ایران کا ایک بادشاہ شہریار ملک الملک شاید اپنی پہلی بیگم کی بے وفائی سے آزردہ ہو کر اسے قتل کرا دیتا ہے۔ اس کے بعد وہ یہ طریق اپنا لیتا ہے کہ روزانہ ایک رات کے لیے ایک خاتون سے شادی کرتا ہے اور اگلے دن صبح اسے قتل کرا دیتا ہے۔ اس طرح جب بہت سی خواتین قتل ہو چکی ہوتی ہیں۔ تو بادشاہ کے وزیر کی بیٹی شہرزاد جو چہرہ زاد سے کثرت استعمال کی وجہ سے ماخوذ ہے۔ چہرہ زاد سے مراد ہے اعلیٰ نسل سے تعلق رکھنے والی جبکہ دینا زاد نیک مذہب سے تعلق رکھنے والی۔ اپنے باپ سے از خود کہتی ہے کہ میری شادی بادشاہ سے کر دیجیے۔ میں بادشاہ کے ہاتھوں قتل ہونے والی خواتین کو اس قبیح رسم سے نجات دلاؤں گی۔ چنانچہ اس کی شادی بادشاہ سے ہو جاتی ہے۔ وہ اپنی بہن یا کنیز دنیا زاد کو بھی اپنے ساتھ بادشاہ کی

خلوت سرا میں لے جاتی ہے۔ وہاں دینازاد شہرزاد سے کہانی سنانے کی فرمائش کرتی ہے ایک اور روایت میں دنیازاد بادشاہ کے محل میں موجود مال واسباب کی نگران (قہرمانہ) ہے اور درپردہ شہزاد سے ملی ہوئی ہے۔ بادشاہ بھی کہانی سننے کا شائق ہے۔ چنانچہ شہرزاد تمام رات کہانی سناتے ہوئے اسے ایسے ادھورا چھوڑتی ہے کہ بادشاہ اسے کہانی کو پورا کرنے کے لیے اگلی رات تک کے لیے زندہ رکھتا ہے، چنانچہ ایک ہزار راتوں تک ایسا ہی ہوتا رہتا ہے۔ اس دوران اس کے ہاں بادشاہ کا بچہ بھی پیدا ہو جاتا ہے اور بادشاہ شہرزاد کو معاف کر دیتا ہے۔ ایک روایت یہ بھی ہے کہ ایرانی بادشاہ بہمن کی بیٹی حمانہ کے لیے یہ کتاب لکھی گئی تھی۔ اگرچہ کتاب کا نام ہزار افسان تھا لیکن کہانیاں دوسو سے بھی کم ہیں۔ ان میں سے بعض کیونکہ کافی طویل اور کئی راتوں پر مشتمل ہیں اس لیے کتاب کو ہزار افسان نام دیا گیا۔ نکلسن کا کہنا ہے کہ میں نے یہ کتاب کئی بار دیکھی لیکن میرے نزدیک یہ کتاب ''عشّون'' باردالحدیث ہے۔ بدمزہ اور غیر دلچسپ۔

اسی نام کے تحت ایک اور روایت دستیاب ہے۔ ابو عبید اللہ محمد بن عبدوس الجھشیاری (متوفی 43،942ء) کتاب الوزراء کے مصنف نے ایک کتاب کی تالیف شروع کی۔ جس کے لیے اس نے ہزار کہانیوں کا انتخاب کیا، جو عربوں، ایرانیوں، یونانیوں اور دیگر اقوام سے متعلق تھیں۔ ہر کہانی کا دوسری سے کوئی تعلق نہ تھا۔ اس نے اپنے پاس کہانی بیان کرنے والوں کو اکٹھا کیا۔ انہیں کہا کہ وہ اپنی اپنی بہترین کہانیاں سنائیں۔ ان میں سے اس نے ہر وہ کہانی چن لی جو اسے پسند آئی۔ وہ ایک باہنر ادیب تھا۔ اس نے 480 راتوں پر مشتمل ایک کتاب تیار کی۔ ہر کہانی کم وبیش پچاس صفحات پر مشتمل تھی لیکن موت نے اسے ہزار راتوں تک پہنچنے کی مہلت نہ دی۔

جھشیاری نے ہزار افسان کا بیج عرب کہانی نویسوں کو مہیا کیا۔ ان میں اُس نے پہلے سے موجود کہانیاں ماہی گیر اور جن۔ قمرالزمان اور بدور اور مسحور گھوڑے کی عمدہ کہانیوں کو بھی اس میں شامل کر لکیا۔ وقت کے ساتھ ساتھ ہزار افسان میں دو طرح کے اضافے ہوتے رہے۔ ایک جن کا تعلق ہارون الرشید کے بغداد سے ہے۔ یہ پرمزاح روایات ہیں۔ دوسری روایات اضافہ کا مرکز قاہرہ ہے۔ یہ مملوک سلاطین کا دور ہے۔ ان میں زیادہ تر جادوئی اور مافوق الفطرت ماحول ہے۔ جیسا کہ ہمیں الہ دین اور حیران کن چراغ میں دکھائی دیتا ہے ان تین ذرائع کے علاوہ بھی عربوں کی راتوں نے ہر طرح اور ہر علاقے کی کہانیاں بھی اپنے اندر جذب کر لیں۔

گذرے ہوئے خوش بخت زمانوں میں عرب قارئین میں رائج تین تالیفات الف لیلہ ولیلہ، عنتر کا قصہ اور سیرتِ زیر بہت مقبول رہیں۔ ان میں سرِ فہرست الف لیلہ ولیلہ ہے۔ اگرچہ دوسری دو کتابوں کی نسبت اس کا پھیلاؤ بہت کم ہے لیکن لوگوں کے دلوں کو خاص طور پر عوام کے دلوں کو بہت زیادہ متاثر کرنے والی کتاب یہی ہے۔ بلکہ اس کی دانائی کچھ حد تک ثقافت یافتہ خواص کو بھی متاثر کرتی ہے۔ اس کی خبریں عوامی ہیں۔ اس کے ناموں کو لوگوں نے اختیار کر لیا ہے۔ اس کے روزمروں اور محاوروں کو

عوام الناس نے اپنا لیا ہے بلکہ عوام الناس نے اپنے کلام میں بھی الف لیلہ کے انداز کو اپنا لیا ہے جبکہ کلیلہ و دمنہ کا اندازِ بیان خواص نے اپنایا ہے۔ دلیل کے طور پر ہم پیش کرتے ہیں کہ کلکتہ، عراق، قاہرہ، بغداد، دمشق، بیروت کے چھاپہ خانوں نے اسے بکثرت شائع کیا ہے بلکہ آج سے ڈیڑھ سو سال قبل فرانسیسی زبان میں اس کا ترجمہ بھی ہو گیا۔ اس ترجمے کے پیروی میں انگریزی میں اس کے دو ترجمے شائع ہوئے اور پھر یورپ کی اکثر زبانوں میں یہ کتاب مترجم ہوئی۔

لیکن اس قدر مشہور و معروف ہونے کے باوجود ہمیں علم نہیں کہ اس کا پہلا کاتب کون تھا۔ ایسی بہت سی کتابیں دنیا میں اور بھی ہیں جن کے مصنفین کے نام معلوم نہیں بلکہ بعض مصنفین جن کی طرف نظمیں اور ڈرامے منسوب کئے جاتے ہیں۔ ان پر بھی شک ہے کہ وہ انہیں کے ہیں یا نہیں۔ مثلاً ہومر اور شیکسپیئر محققین ہمیشہ سے کوشش میں لگے ہوئے ہیں کہ الف لیلہ ولیلہ کا پہلا مصنف کون تھا۔ کس قوم سے تھا۔

الشروانی نے اس نسخے کے دیباچہ میں جو ایران سے شائع ہوا سے لکھا ہے کہ اس کتاب کا اوّل مصنف شامی تھا، اس نے اسے آسان عربی میں اس ارادے سے لکھا کہ عربی زبان کی تعلیم حاصل کرنے والوں کو اس کے پڑھنے اور سمجھنے میں آسانی ہو۔ اس کی رائے سے فرنچ مترجم DeSacy کی رائے بھی ملتی ہے کہ اس شامی کی اصلی کتاب پر بعد کے ناقلین اور حکایات بیان کرنے والے کہانیوں کا اپنے زمانے میں اور اپنے علاقے میں اپنے پاس سے اضافہ کرتے چلے گئے۔

لیکن الاب صالحانی کا چھ دلیلوں کے ساتھ یہ دعویٰ ہے کہ اس کتاب کا کاتب عربی تھا اور سند کے طور پر جھشیاری کے بارے میں جو الفہر ست میں تحریر ہے۔ اسے بطور دلیل پیش کیا البتہ انگریز مترجم Hommer اس بیان پر مزید اضافہ کرتا ہے کہ اگر ہزار افسان کا مصنف ایرانی نہیں تو پھر ہندی ہے۔ Loisleur (لیوئس لیر)، ڈیسی لانگ چیمپری(Deslang Champre)، Gildmeister (گلڈمیسٹر اور Dechlegel (شیلیگل) ان سب کے خیال میں بھی یہ کتاب اوّلاً ہندی ہے لیکن فارسیوں اور عربوں کو اس کی تصنیف میں فضلیت حاصل ہے کہ ہندی ایک بھی روایت یا نسخہ موجود نہیں۔ فارسی یا قدیم پہلوی نسخہ بھی موجود نہیں مگر شہریار، شہرزاد دنیازاد، ہزار افسان حالصتاً ایرانی ہیں۔ پس اصل حقیقت یہ ہوئی کہ الف لیلہ ولیلہ کی حکایات کا کوئی معین لکھنے والا نہیں بلکہ یہ مشرقی عیسائی، ایرانی، عربی، عراقی، شامی اور مصری قوموں کے خیالات کا مجموعہ ہے۔ اس کی تدوین وتالیف میں قاہرہ، بغداد، دمشق کے کاتبوں نے حصہ لیا۔ ہر علاقہ کے کہانی نویسوں کے ہر زمانے اور ہر مقام پر اس میں اضافے کیے۔ یہاں تک کہ ہر مے اور ہر مطبوعے میں اپنی طرف سے بھی کہانیاں، خبریں اور فصلیں ڈال دیں جبکہ کتاب کا سرنامۂ الف لیلہ ولیلہ ہی رہا۔ پس اس طرح اہلِ ہند اہلِ ایران عرب اور مصر کے لوگوں کی کہانیاں اور اخبار کے بہت سے حصے اس کتاب میں موجود ہیں جو اس کتاب کے بکثرت چھپنے کی وجہ سے ان کی طبیعتوں کی تصاویر ہیں اور ان کے

معاشی حالات ہیں۔ غالب رائے یہی ہے کہ اس کی حکایات ہندوستان، فارس، مصر، شام اور عراق سے لی گئی ہیں۔ کچھ کہانیاں کبھی کسی قوم میں پیدا ہوئیں اور کچھ کسی اور قوم میں بعد میں آنے والی قوموں نے انہیں نقل کیا۔ اس لیے قابلِ ترجیح بات یہی ٹھہری کہ اس کتاب کی تالیف کے زمانے سے لوگ ناواقف ہیں۔ مگر ان کہانیوں میں غلبہ کیونکہ عربوں کا ہے۔ اسی بنیاد پر DeSacy اس بات کا قائل ہے کہ جمع و تدوین کا پہلا عمل عباسی خلفاء کے زمانے میں ہوا۔ جو 750ء سے 1258ء تک پھیلا ہوا ہے اور پندرھویں صدی عیسوی سے پہلے یہ کتاب قہوہ اور تمباکو کے ذکر سے خالی ہے۔ اس کے بعد ایسی حکایات ہیں جن میں ان کا ذکر موجود ہے لیکن اس کے لیے بھی وہ کوئی محدود وقت متعین نہیں کرتا۔

Macdonald انگریز مترجم بالتاکید لکھتا ہے کہ مسعودی (متوفی 956ء) مورخ کے عہد میں یہ کتاب جانی پہچانی تھی اور اسکے بعض حصے پہلوی سے اسی عہد میں ترجمہ ہو گئے تھے۔ جس عہد میں کلیلہ و دمنہ ترجمہ ہوئی۔ ہزار حکایات کا مجموعہ عباسیوں کے عہد میں ویسے ہی پڑھا جاتا ہے جیسے وہ فاطمی خلفاء کے عہد میں قاہرہ میں پڑھا جاتا تھا۔

الاب صائحانی سے رائے قائم کی کہ کتاب کی عبارت قدیم عبارت نہیں بلکہ ویسی ہی ہے جیسی ہمارے اس زمانے میں ہے۔ اس لیے شک پڑتا ہے کہ یہ کتاب اس عباسی عہد میں تحریر ہوئی۔ جب عربی زبان رونق کے اعتبار سے اپنے انتہائی عروج پر تھی، اس لیے وہ اعتقاد نہیں رکھتا کہ کتاب پندرھویں صدی عیسوی سے پہلے تحریر کی گئی جب ہم اس ہیئت پر اعتبار کریں۔ جس میں وہ اس وقت ہے پس غالب رائے یہ ہے کہ الف لیلہ و لیلہ کا مجموعہ جیسا کہ اسے ہم آج کل پہچانتے ہیں۔ اس نے اپنی موجودہ شکل تیرہویں چودہویں صدیوں کے بیچ کہیں اختیار کی۔ اسے کہانی لکھنے والوں نے عوامی زبان میں جمع کیا۔ عظیم ادباء اور منشیوں نے اپنے قلم اس کی تحریر میں استعمال نہیں کیے۔ اسی لیے یہ موجودہ زمانے کی وضع کے مطابق ہے اور اسی لیے عربی عوامی قارئین کے درمیان اس کا پھیلاؤ اور رواج ہے۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ ان میں سے کچھ کہانیاں کو اوّل اوّل لکھنے والوں کے دلوں میں یہ خیال گذرا ہوگا کہ آگے چل کر اس کا نام الف لیلہ و لیلہ ہوگا۔ یہاں تک کہ جن لوگوں نے ان کہانیوں کو ایک کتاب کی شکل میں جمع کیا۔ انہوں نے اسے یہ نام نہیں دیا۔ پہچان اور حد بندی کو مدِ نظر رکھتے ہوئے پہلے اس کا نام الف خرانہ رکھا گیا پھر الف لیلہ اور آخر کار الف لیلہ و لیلہ ان ناموں میں تبادلے کیوں کیے گئے۔ اس کا کوئی قابلِ قبول جواب کسی کے پاس نہیں ہے۔

جس نام سے یہ کتاب پہچانی جاتی ہے۔ وہ ترکی عہد میں رکھا گیا یا اس سے پہلے اسے عربوں نے اختیار کیا ہوا تھا۔ کچھ بھی ہو اس نام میں لفظی تنغیم و موسیقی بہت ہے۔ یہ نام باعثِ تشویق ہے۔ کتاب کے مطالعے پر اکساتا ہے۔ اس میں ابہام اور ایمائیت ہے۔ اہلِ مشرق کا مبالغے کی طرف جو میلان ہے۔ اس میں اس کا اظہار ہے۔ یہ نام عربوں کی ہیبت کو قائم کرنے والا ہے کیونکہ عربی میں ہزار سے اوپر گنتی

کے لیے مفرد الفاظ نہیں ہیں۔ ہر لحاظ سے اس نام کا ایک بلند مقام ہے۔ اسی لیے خوبصورت اور خوبصورت کتابوں کے لیے خوبصورت نام ہے۔

الف لیلہ و لیلہ کے جانے پہچانے مخطوطے ایک خاتمے پر متفق نہیں ہیں بلکہ ہر مخطوطہ الگ خاتمہ رکھتا ہے۔ بولاق سے شائع شدہ نسخہ اور Gallandk کے فرانسیسی نسخے میں کتاب کا خاتمہ اس طرح ہوتا ہے کہ بادشاہ شہر یار شہزاد اور اس کی کہانیاں بیان کرنے کی پختہ صلاحیت سے بہت متاثر ہوا اور اس نے خوش ہو کر اسے قتل کرنے سے معاف کر دیا۔

لیکن صاحب فہرست نے جو تلخیص پیش کی ہے۔ اس میں ہے کہ شہزاد بادشاہ کو من گھڑت کہنیاں سناتی رہی اور ہر رات کے گذرنے پر ہر کہانی کو ایسے مرحلے میں چھوڑتی رہی کہ بادشاہ اسے اگلی رات کے لیے باقی رکھے یہاں تک کہ اس کے ہاں بادشاہ کا لڑکا پیدا ہو گیا۔ بادشاہ نے اسے معاف کر دیا۔ اس کی طرف اس کا میلان بڑھ گیا اور اس نے اسے باقی رکھا۔

مگر Hommer کا مخطوطہ اس بیان پر ختم ہوتا ہے کہ بادشاہ شہزاد کی کہانیاں سن سن کر تھک گیا، ملول ہو گیا۔ اس نے اسے قتل کرنے کا ارادہ کیا لیکن اس کے ہاں کیونکہ بچہ پیدا ہو چکا تھا اس لیے اس کی خاطر اس نے اسے باقی رکھا۔

کلکتہ سے شائع ہونے والے نسخے میں ہے کہ ایک ہزار راتوں کی توقیت تین بچوں کی پیدائش کے لیے کافی ہے۔ اس کے ہاں تین بچے پیدا ہو چکے تھے۔ اس لیے اسے باقی رکھا گیا۔

مختصراً ہمیں معلوم ہوا کہ شہزاد نے اس عاقلانہ حیلے کا سہارا اپنے آپ کو قتل کے عذاب سے نکالنے کے لیے کیا۔ کہانیوں کے بیان کرنے میں اس کی مہارت نے اس کی زندگی کو بچایا۔ اس نقطے میں کتاب کے قارئین میں ایک شوق پیدا کرنے کی صلاحیت ہے۔ اس کے علاوہ جو تفاصیل ہیں۔ ان پر تحقیق کرنے والوں کے لیے تو گنجائش ہے لیکن تمام قارئین کو اس تحقیق سے کوئی دلچسپی نہیں۔

الف لیلہ و لیلہ کہانیوں کا مجموعہ ہے۔ جس میں ہر طرح کے مرد و زن ہر طرح کے جن، عفریت، فرشتے، حیوان، پرندے، چوپائے، حشرات الارض ہر پیشے کے لوگوں علماء، شعراء، ادباء، دوستوں، دشمنوں ہر طرح کی پاکباز و بدنیت عورتوں ہر طرح کی معلوم مخلوقات کو بطور کردار پیش کیا گیا ہے۔ انسان جانوروں سے ان کی زبان میں ہم کلام ہیں اور جانور ان سے ان کی زبان میں۔ انسان حیوان بن جاتے ہیں۔ پھر انسان ہو جاتے ہیں۔ مردے زندہ ہو جاتے ہیں۔ گھوڑے اڑتے ہیں، پرندے بھاگتے ہیں۔ لوگ پتھر ہو جاتے ہیں۔ چشمے جم جاتے ہیں۔ عفاریت بخار بن کر اڑ جاتے ہیں۔ یہ وہ عالم ہے جس میں معبود رسول، ارواح، عیشاق، عفاریت، فرشتے، شیاطین، حیوان، انسان، جادوگر، حکیم، جہلاء پور مسافر، حیلہ گر، قاتل اور مجرم اکٹھے زندگی گذارتے دکھائی دیتے ہین۔

اس کتاب کا عالم عجیب ہے جس میں خرق عادات کارنامے، جنگ کا بیان، مرنے والوں اور

بہادروں کی تصاویر کھینچی گئی ہین۔ طبائع کا بیان تقالید وعادات آدمیوں کا حیران کن زندگی گزارنا۔ اس میں حکمت نصیحت عبرت کی باتیں بھی ہیں۔ اشارات، تلمیحات، ایمائیات، حکیموں، فلسفیوں، ادیبوں، شاعروں کے اقوال سے بھی گواہی لی گئی ہے۔ اللہ کے نام کے خوشخبری اور بشارت بھی ہے دین حنیف کی لاخایہ دعوت بھی ہے کہ اللہ ہر گھڑی اپنے نیک بندوں اور اپنے حضور میں پناہ لینے والوں کے ساتھ ہے۔ فرشتے بھی ان کیساتھ ہیں۔ وہ اپنے نیک بندوں کی امیدوں کو ناکام نہیں بنایا انہیں جنوں اور شیطانوں کے حوالے نہیں کرتا۔

جہاں تک الف لیلہ ولیلہ کے اسلوب کا تعلق ہے۔ تو اس بارے میں چند سوالات ہیں، کیا یہ اسلوب جو ہمیشہ سے ہے اور شروع سے آخر تک ہے۔ کہانیوں کے بیان کا اسلوب ہے۔ اسے کچھ نقصان پہنچاتا ہے۔ یہ بے حد آسان ہے سلیس سے پر رونق ہے۔ مرغ کی آنکھ کی مانند ہے شکل سمجھ میں نہ آنے والا اور پر تکلف نہیں ہے۔ اسے کچھ نقصان دے رہا ہے کیا یہ اسلوب جو ایک عوامی آدمی کا عوام کے لیے ہے اور کسی مخصوص کاتب کا مخصوص لوگوں کے لیے نہیں ہے۔ نیز کیا اسے نقصان نہ پہنچاتا اگر یہ اسلوب کسی جگہ پست کسی جگہ احمقانہ ایک جگہ عالمانہ دوسری جگہ مضحک یہاں خواصی وہاں بازاری یہاں درست وہاں غلط ہوتا۔ یہ کہانیوں کا اسلوب ہے۔ الف لیلہ ولیلہ کا اسلوب اور طرزِ بیان ہے۔ اگر اس کتاب کو ابن المقفّع یا جاحظ یا ابن عبدربہ لکھتا یا ایسا کوئی چوتھا تو اس میں فصاعت بلاغت اور دلوں کو مطمئن کرنے والا بیان ضرور ہوتا۔ لیکن الف لیلہ ولیلہ اتنی کامیابی کے ساتھ عوام الناس کے دلوں تک نہ پہنچتی اپنا عمل ان کے خیالوں میں نہ دکھاتی۔ ان کی زندگی پر اتنا اثر نہ چھوڑتی اور ان کے لیے باعث تقویت نہ ہوتی۔ اس کے قارئین میں ہر زمانے میں مسلسل افسانہ نہ ہوتا۔ اگر اوپر بیان کردہ علماء اسے لکھتے تو بیان کا یہ جدید انداز ہوتا۔ جو آج کل اس میں ہے۔ پس قابلِ تعریف ہے اللہ کی ذات کہ ان کہانیوں کے لکھنے والے بہت سے ہیں۔ سب کے سب عوامی کاتب ہیں۔ مختلف زمانوں اور مختلف علاقوں سے ہیں۔ مختلف لوگوں کے قلموں نے انہیں تحریر کیا، اگر ایسا نہ ہوتا تو ہم اس کتاب کو دوبارہ سہ پارہ چہار بارہ بلکہ بار بار بازار میں نہ لاتے، پس ہمیں یہ دعویٰ کافی ہے کہ اس کتاب کو عوامی کاتبوں نے عوام الناس کے لیے لکھا۔ اس لیے اس کا بار بار شائع ہونا حق بن گیا۔

الف لیلہ ولیلہ کی مشہور ومعروف کہانیوں میں کھل جا سِم سِم والے علی بابا اور چالیس چور کی کہانی بہت ہی جانی پہچانی ہے۔ علاوہ برایں الہ دین اور چراغ کا جن، سندباد جہازی کے سات سفر سوتے جاگتے کی کہانی، ابوکریم کے جوتے، بغداد کے چور، ابوالحسن اور ہارون الرشید کی کہانیاں، کبڑے بونے کی کہانی دنیا بھر میں نہ صرف شناخت یافتہ رہیں بلکہ ان پر امریکہ، برطانیہ، یورپ کے اکثر ملکوں ہندوستان و پاکستان میں فلمیں بن چکی ہیں۔ جنہیں عوام الناس بہت پسند کرتے ہیں۔

آج سے چار سال قبل میرا جانا عراق ہوا تھا۔ صدام حسین کے مجسمے اور پینٹگز تو پورے عراق

میں ہر دس میل پر بنے ہوئے ہیں۔ صدام حسین کو اپنی پرانی بابلی تہذیب پر بہت ناز تھا۔ اس لیے اس نے بڑے شہروں میں بابلیوں کے رزق کی دیوی اشتار کے مجسمے بھی بنوائے ہوئے تھے۔ علاوہ ازیں صدام حسین نے الف لیلہ ولیلہ کتاب پر بھی فخر ومباہات کا اظہار اس طرح کیا ہے کہ بغداد میں میں نے علی بابا کی کنیز مرجانہ کا مجسمہ دیکھا بلکہ پورے سین کو پتھر میں مجسم کیا گیا ہے کہ گھڑوں میں چھپے ہوئے بند چور ان کے سامنے پڑے ہوئے ہیں۔ اسے معلوم ہو جاتا ہے کہ ان میں چور ہیں۔ وہ تیل کا ایک کڑاہا گرم کرتی ہے اور تھوڑا تھوڑا کر کے تیل ایک ایک گھڑے میں انڈیل رہی ہے۔ نتیجہ کے طور پر گرم تیل سے تمام چوروں کو گھڑوں میں ہی ہلاک کر دیتی ہے اسی طرح الف لیلہ ولیلہ کے مناظر بھی صدام حسین نے شاید مجسم کرائے ہوں۔ مگر میرے دیکھنے میں نہیں آئے۔

☆☆☆

ڈاکٹر روبینہ ترین

فراق ــــ اپنی نظر میں

رگھوپتی سہائے فراق گورکھپوری بیسویں صدی عیسوی کے شاعر اور نقاد کا نام ہی نہیں بلکہ وہ اپنی شخصیت، مزاج، ذاتی زندگی، شاگردوں اور دوستوں کے درمیان بیٹھے گفتگو کرتے ہوئے ہر مرتبہ ایسے شخص کے روپ میں سامنے آتے ہیں کہ جس کی شخصیت کی مختلف پرتیں ہیں۔ اگر چہ فراق کی شاعری اور تنقید پر بہت کچھ لکھا جا چکا ہے اور شخصیت کے بارے میں بھی، لیکن اس کے باوجود اُن کی شخصیت لوگوں کے لئے جاذب اور پُرکشش ہے، کیونکہ انھوں نے زندگی کو تخلیقی سطح پر بسر کرنے کی کوشش کی اور اپنی شخصی کمزوریوں پر پردہ ڈالنے کی بجائے اُن کا شاعرانہ اور مفکرانہ دفاع کیا، انھوں نے ستاسی برس کی محض عمر نہیں پائی تھی بلکہ اس کو بسر بھی کیا تھا، بعض دقتوں اور علالتوں کا شاعرانہ شکوہ کرنے کے باوجود بھرپور زندگی گزاری۔ سب سے بڑھ کر یہ کہ بڑی جرأت اور بیباکی سے اپنی ذات اور شخصیت کا محاکمہ بھی کیا اور اپنے تصوراتِ حیات کا اظہار مصلحت سوز انداز میں کیا، شمیم حنفی نے لکھا ہے

> ’’فراق صاحب کے ذہنی سوانح کا مرقع اُن کی باتیں ہوتی تھیں، اسی آئینے میں اُن کی بے مثال ذہانت، ان کی بے پناہ خلاقی، اُن کے محسوسات کی شدت، اُن کے افکار کی بوقلمونی، اُن کے رویوں کی بوالعجمی، اُن کے تعصّبات اور ترجیحات، اُن کے محاسن اور معائب غرض یہ کہ پوری شخصیت کا عکس جھلکتا ہے‘‘
>
> (پیش لفظ فراق_ شاعر اور شخص، ص۱۰)

فراق بچپن ہی سے ذہین، حساس اور بدصورتی سے نفرت کرنے والے انسان تھے، بچپن سے آخری عمر تک اپنی غیر معمولی ذہانت اور حساس طبیعت کی بدولت وہ ذاتی زندگی میں یا اپنے اردگرد پھیلی بدصورتی کو کبھی قبول نہ کر سکے۔ انھوں نے اپنی ابتدائی زندگی کے حوالے سے یہ پُرمعنی بات لکھی اور اس بات کا اقرار بھی کیا کہ

> ’’بچپن ہی سے میری رگ رگ حساس تھی میری والدہ کا کہنا تھا کہ میں بچپن ہی سے کسی بدقول اور بدصورت مرد اور عورت کی گود میں نہیں جاتا تھا‘‘
>
> (☆میری زندگی کی دھوپ چھاؤں، ص۲۳)

جو شخص محمد حسین آزاد کی آبِ حیات سے تخلیقی طور پر لطف اندوز ہوتا ہو، وہ اپنے بچپن کے بارے میں ایسا بیان گھڑنے کی صلاحیت بھی رکھتا ہے مگر اس بیان کو اُن کی زندگی کے ایک بڑے واقعے سے ملا کر دیکھیں جسے فراق نے سانحہ قرار دیا تو ایک مضطرب قسم کی ناآسودگی ان کی ذات کا احاطہ کیے

ہوئے دکھائی دیتی ہے یہ اُن کی زندگی کا ایسا ماجرا ہے کہ جسے انھوں نے سب سے بڑا دھوکہ اور سانحہ قرار دیا یعنی کشوری دیوی سے اُن کی شادی جسے انھوں نے عمر بھر قبول نہ کیا اور ناپسندیدگی کا اظہار بھی آخری عمر تک کچھ اس طرح کرتے رہے کہ

> ’’میری بیوی میں کوئی اخلاقی عیب نہیں تھا لیکن معمولی سے معمولی انسان سے بھی یہ لڑکی کند ذہن اور نااہل تھی صورت میں کوئی کشش نہیں تھی، بلکہ الٹے شدید ناپسندیدگی کا اثر پڑتا تھا‘‘ (میری زندگی کی دھوپ چھاؤں، ص۲۳)
>
> ’’پورے خاندان پر نحوست چھا چکی تھی چوبیس گھنٹے میں ایک پل بھی ایسا نہیں گزرتا تھا کہ مجھ کو اپنی ازدواجی زندگی کی بدنصیبی بھول سکے‘‘
>
> (میری زندگی کی دھوپ چھاؤں، ص۲۵)

اپنی ازدواجی زندگی کی ناکامی، والد کی علالت اور وفات، پھر دو جوان بھائیوں اور جوان بیٹی کی وفات اور سب سے بڑھ کر جوان بیٹے کی خودکشی، فراق گورکھپوری کی زندگی کے ایسے واقعات ہیں کہ جنہوں نے اُن کے اندر غم سہنے کی صلاحیت تو پیدا کر دی تھی مگر کسی بھی شخص کی نجی زندگی میں حشر برپا کرنے کی غیر معمولی قوت رکھتے تھے۔ کم عمری میں شادی، والد کی وفات کے بعد والدہ اور بہن بھائیوں کی کفالت کا بوجھ فراق کیلئے مسائل تو پیدا کرتے رہے لیکن انھوں نے باحوصلہ شخص کی طرح انہیں برداشت کیا، انھوں نے اپنی تمام توجہ تعلیمی استعداد کے اضافے میں صرف کی، اپنی تیز اور غیر معمولی صلاحیتوں کے باعث بے پناہ مطالعہ کیا انگریزی، اردو، سنسکرت اور فارسی زبانوں پہ انہیں مہارت حاصل تھی، شروع سے ہی انگریزی زبان کو اپنا وسیلہ اظہار اس طرح بنایا کہ وہ اس زبان کے نباض اور انشا پرداز محسوس ہوتے ہیں۔ انہیں اس بات کا احساس بھی تھا کئی مواقع پر اظہار کیا کہ

> ’’میں جو کچھ لکھتا تھا لفظوں اور معنی کی تہہ پر پہنچ کر لکھتا تھا پڑھنے والے کو ایسا محسوس ہوتا تھا کہ حقائق اور معنی کو چھو رہا ہوں اور اپنے بیان کو سراسر لمسیاتی بنا رہا ہوں‘‘
>
> (میری زندگی کی دھوپ چھاؤں، ص۳۵)

اس طرح محمد طفیل کے نام ایک خط میں یہ حصہ بھی معنی خیز ہے کہ

> ’’مغربی ادب خصوصاً ورڈ سورتھ کی شاعری اور انگریزی ادب کے دیگر اکابرو مشاہیر کے کارنامے، سنسکرت ادب کے کارنامے، فارسی ادب کے کارنامے، مجھے برابر متاثر کرتے رہے ہیں۔ میری اُردو شاعری جذبات وخیالات کے معاملے میں اردو معیار شاعری سے متاثر نہیں رہی۔ البتہ جہاں تک زبان و بیان کا تعلق ہے۔ میں اردو شاعری کے مشاہیر سے استفادہ کرتا رہا ہوں، پھر بھی اپنی اردو کو اپنے وجدان کے سانچے میں ڈھالتا رہا ہوں اور اس کی کوشش

کرتا رہا ہوں، کہ میرے اسلوب میں کتابوں کی زبان کے بدلے زندگی کی اور تاثراتِ زندگی کی زبان جیتی جاگتی شکل میں اُجاگر ہو۔ پھر کسی کیفیت کو محض مکمل طور پر بیان کر دینا میرا مقصد نہیں رہا۔‘‘ (من آنم، ص۲۰)

زندگی کے غیر معمولی واقعات، پھر تحریک آزادی میں عملی شرکت، نہرو خاندان سے تعلقات، برس ہا برس تک یونیورسٹی میں انگریزی ادبیات کی تدریس، جوانی میں ہی بطور شاعر اعلیٰ مقام حاصل کرنا، مداحوں کا وسیع حلقہ میسر آنا، یہ سب ایسے محرکات ہیں کہ جو کسی شخص کو خود ستائی بلکہ خبط عظمت میں مبتلا کر سکتے ہیں ایسا شخص اپنی زندگی کے حوالے سے بیانات کو بہتر بنا سکتا ہے وہ اپنی کمزوریوں کی فلسفیانہ توجیہہ کر سکتا ہے لیکن ایسا سو فیصد نہیں ہوا فراق نے اپنی شخصی کمزوریوں کا ذکر کرتے ہوئے جوش ملیح آبادی کی طرح شیخی نہیں بگھاری بلکہ کوشش کی ہے کہ اکثر خود آگہی اور خود تنقیدی کا پیرایہ اختیار کیا جائے۔ ان کا یہ رویہ خود ملامتی کا ہر گز نہیں ہے بلکہ اپنے بارے میں ایسے تنقیدی بیانات ہیں جو ان کے مرتبے کو بلند کرتے ہیں کوئی بھی بڑا شاعر کبھی اپنے کلام پر تنقید برداشت نہیں کرتا لیکن فراق ایسا شاعر ہے کہ جو اپنی ہی شاعری کے بارے میں دعویٰ کرتا ہے کہ میں اس سے بہتر شاعری کا تصور کر سکتا ہوں، اپنی ہی شاعری پر تنقید کر رہا ہے، ہندوستان کا وہ شاعر جو نصف صدی پہلے اپنی تخلیقات کے باعث اردو کے ایک بڑے شاعر کی حیثیت اختیار کر چکا ہے، جسے ایک نہیں کئی زبانوں پر مہارت حاصل ہو، جو وسیع مطالعہ رکھتا ہو وہ اپنے کلام پر تنقید کرتا ہے کہ مئی جون ۱۹۵۳ء کے نقوش کے شمارے میں شائع شدہ اپنی ہی غزل کے مقطع کی تصحیح کی جو کہ اس طرح شائع ہوا :

اے فراق عشق ہے وہ اک شرر خود افروز
کہ جلا بھی نہ سکوں اور بجھا بھی نہ سکوں

فراق کے نزدیک اس مصرعہ میں کئی عیب ہیں اور تصحیح کے بعد مقطع اس طرح لکھا:

عشق کی آگ ہے وہ آتشِ خود سوز فراق
کہ جلا بھی نہ سکوں اور بجھا بھی نہ سکوں

(من آنم، ص۱۴۹)

ایک اور موقع پر ستمبر ۵۳ء کے نقوش میں شائع شدہ غزل کے دو اشعار کی نہ صرف تصحیح کی بلکہ ایک نیا شعر بھی لکھ دیا، لکھتے ہیں:

’’اپنی اُس غزل کے بارے میں بتانا چاہتا ہوں جو اس شمارہ میں شائع ہوئی ہے۔ اس غزل کے دو شعر یوں شائع ہوگئے ہیں:

کبھی پائے پائے ہوئے تجھے کبھی کھوئے کھوئے ہوئے تجھے
کبھی بے نیازِ تلاش ہے کبھی عشق مائلِ جستجو،

یہ کہاں سے بزمِ خیال میں امنڈ آئیں چہروں کی ندیاں
کوئی مہ چکاں کوئی خوں فشاں کوئی زہرہ وش کوئی شعلہ رُو

یہ اشعار یوں ہیں:

کبھی پائے پائے سے ہم تجھے کبھی کھوئے کھوئے سے ہم تجھے
کبھی بے نیازِ تلاش ہے کبھی دل ہے مائلِ جستجو
یہ کہاں سے بزمِ خیال میں امنڈ آئیں چہروں کی ندیاں
کوئی مہ چکاں کوئی خورفشاں کوئی زہرہ وش کوئی شعلہ رُو

پائے پائے ہوئے، کھوئے کھوئے ہوئے، بالکل غلط ہے، دوسرے شعر میں خوں فشاں بے معنی ہے۔ اس غزل کا ایک اور شعر جو شائع شدہ غزل میں نہیں ہے۔ یوں ہے

کرے زندگی کو جو زندگی جو ہر ایک دل کو بنائے دل
تری جستجو ہے وہ جستجو تری آرزو ہے وہ آرزو

(من آنم، ص۱۵۶۔۱۵۷)

یہ فراق گورکھپوری کی عظمت ہے کہ اچھے شاعر کی طرح وہ اپنے لکھے ہوئے کلام پہ نظر ثانی بھی کرنے سے نہیں گھبراتے اور اگر اس میں غلطی رہ گئی تو تصحیح بھی کرتے ہیں۔

من آنم میں لکھتے ہیں کہ

’’میرا ہر اچھا شعر عظیم ترین شاعری نہیں ہے لیکن کس شاعر کا اچھا شعر عظیم ترین شاعری ہے؟ میں جیسی اچھی اور جتنی اچھی شاعری کر سکا ہوں، اس سے کہیں اچھی شاعری کا تصور کر سکتا ہوں۔ اگر مجھے اپنے پورے کلام پر نظر ثانی کرنے کی فرصت ملی (میں اسی فرصت کو پیدا کرنے کی کوشش کر رہا ہوں) تو میں اپنے بہت سے اشعار کو اور بھی چمکا دینے کی امید رکھتا ہوں۔ خاص کر غزلوں کے اشعار اور اپنی بہت سی رباعیوں کو۔ انہیں پھر سے چھونے کی ضرورت ہے‘‘ (من آنم، ص۳۹)

’’میری چند نظمیں بھی منظوم صحافت سے آگے نہیں بڑھ سکیں‘‘

(من آنم، ص۱۲۰) (۱۷ جولائی ۱۹۵۳ کو محمد طفیل کے نام خط لکھا)

فراق کو یہ بھی احساس ہے کہ اُن کے ہم عصر شعرا کا کلام نئے شعراء کی نسبت منفرد رہے لکھتے ہیں کہ:

’’میں نے یہ کبھی نہیں چاہا کہ میں میر، غالب، نظیر اکبر آبادی، آتش، اقبال، جوش یا کسی بھی مشہور اردو شاعر کا طبع دوم بن کے رہ جاؤں، میرا یقین ہے کہ اگر میرے کلام سے تمام مقطعے کاٹ دیئے جائیں اور دوسرے مشاہیر اردو کے نمائندہ کلام سے اُن کے مقطعے کاٹ دیئے جائیں اور ان سب کو گڈمڈ کر کے

> ایک پلندہ بنادیا جائے، تو اہل نظر حضرات اس بے نام وتخلص پلندے میں سے میرا اور دوسرے شعرا میں سے ہر ایک کا کلام الگ الگ کر لینے میں قریب قریب سوفیصدی کامیاب ہوجائیں گے، لیکن دور حاضر یا گذشتہ ادوار کے دوئم اور سوئم مرتبہ کے شعرا کا کلام اس طرح گڈ مڈ کر دیا جائے اور نواب جعفر علی اثر کے مجموعہ ''بہاراں'' کی غزلوں سے مقطع کاٹ کر اس دوئم اور سوئم درجے کی شاعری کے پلندے میں ملادی جائیں تو ان شعرا کے کلاموں کو الگ الگ کرنے میں کسی کو کامیابی نہ ہوگی'' (من آنم، ص۴۴)

عموماً اردو شاعری میں روا رہا ہے کہ لوگ اپنے علاوہ دوسروں کی بڑائی کو تسلیم نہیں کرتے لیکن فراق نے اپنے عہد کے دیگر شاعروں کی کی بڑائی کو بھی تسلیم کیا ہے۔ فراق سچے اور مزاج کے ایماندار شخص تھے انہوں نے ہمیشہ دوسروں کی خوبیوں کا اعتراف کرنے میں کبھی عار محسوس نہیں کیا ان کی فکر و بصیرت کی تربیت میں ہندو معاشرت، ہندو فلسفہ، مسلم تہذیب، اردو، فارسی زبان مغرب کے مفکروں اور شعرا کی بہترین تخلیقات کا مطالعہ شامل ہے۔ یہی چیزیں انکے طرز فکر اور اسلوب اظہار میں خوبصورت انداز میں شامل ہیں وہ جن لوگوں کے علم اور قابلیت کا اکثر ذکر کرتے تھے اُن میں ڈاکٹر تاراچند، ڈاکٹر رادھا کرشن، پروفیسر احتشام حسین، پریم چند، ناصر فراق، رام موہن رائے، جواہر لال نہرو، گاندھی جی (ان کے ساتھ پسند و ناپسند کا تعلق تھا کبھی بہت تعریف کرتے تھے اور کبھی زبردست تنقید) میر تقی میر، غالب، اقبال، جوش، انیس کے علاوہ نیاز فتح پوری.... کالرج، شیکسپیئر، سٹالن، ہٹلر کا ذکر ملتا ہے اور بہت سوں کی عظمت کا اعتراف بھی اکثر مواقع پر کیا ہے۔ انہیں خیالی مصنفوں کا حوالہ دینے میں بھی کمال حاصل تھا۔

فراق کو اردو کے بیشتر ادیبوں اور شاعروں کی ایک کمزوری کا شدید احساس تھا اور انہوں نے اس بات کی شعوری کوشش کی وہ اپنی ذات کے مکالمے کو غیر دلچسپ نہ ہونے دیں، صمد پرشاد شوق کو ایک انٹرویو دیتے ہوئے انہوں نے کہا تھا

> ''زیادہ تر اردو شعرا و ادیب غیر دلچسپ آدمی ہوتے ہیں ان کا ادب تو ہمارے لئے کشش رکھتا ہے لیکن اُن کی شخصیتوں میں میں نے کوئی کشش محسوس نہیں کی اُن کی گفتگو بہت معمولی تھی اُن کی جبلی قوتیں اُن سے شعر تو کہلا رہی تھیں لیکن یہ قوتیں اُن کے عہد کی شخصیتوں کو کچھ دے نہیں پاتی تھیں''

(جہانِ ذوق، مرتب تاج سعید، سنگ میل لاہور ۱۹۹۱ء ص ۱۰۸، ۱۰۹)

سو انہوں نے اپنے مطالعے، اپنے مشاہدے، اپنے تہذیبی شعور، اپنے زرخیز تخیل اور اپنے شدید محسوسات سے جس طرح اپنے فن کو سنوارا اسی طرح اپنی ذات اور اُس کے اظہار کی صلاحیت کو بھی سنوارا اور نکھارا۔

ابن حسن جمالیات (۱)

ادب اور معروضی حقیقت

کیا جمالیات کا سائنسی علم ممکن ہے؟

شوکت نعیم قادری

ڈاکٹر سیّد عبداللہ اور ناول

درس و تدریس ہر نہج سے نہ صرف ایک مشکل امر ہے بل کہ ایک مشکل فن بھی ہے۔اسی لیے بعض ماہرین اِس کے لیے PerformingArt کی اصطلاح استعمال کرتے ہیں پھر اپنی نوعیت کے حوالے سے اِسے ''پیغمبرانہ شعبہ'' بھی کہا جاتا ہے۔یہاں میں نے لفظ ''پیشہ'' کی بجائے لفظ ''شعبہ'' استعمال کیا ہے کیوں کہ ''پیغمبری'' اور ''تدریس'' دونوں ہی ''پیشے'' نہیں ہیں بل کہ ''خدمتِ خلق'' کے شعبے ہیں۔ پروفیسر خلیل صدیقی مرحوم نے بجا طور پر تدریس کو ''تیاگیوں'' کا ایک ''کل وقتی'' شعبہ کہا ہے۔جب کوئی شخص اِس شعبے کو اختیار کر لیتا ہے تو وہ تیاگی بن کر تمام عمر مسلسل محنت، لگن، مطالعہ اور ریاضت کو اپنا شعار بنا لیتا ہے۔اِنھی خصائص کے بہ موجب اُس کا نام ایک کامیاب اور مثالی اُستاد کی حیثیت سے روشن ہو جاتا ہے۔

ڈاکٹر سیّد عبداللہ کا شمار ایسے ہی اساتذہ میں ہوتا ہے۔ اُنھوں نے انتہائی محنت، لگن اور ریاضت سے اپنی راہ متعین کی اور دنیا بھر میں اُن کے لاتعداد شاگرد ہی اُن کی کامیابی کی دلیل ہیں۔زمانۂ طالبِ علمی میں اُن کی بہت سے تصانیف زیرِ مطالعہ رہیں اور میں نے اُن سے خوب کسبِ فیض کیا۔ان کتب سے جو اہم نام مجھے یاد آتے ہیں وہ یہ ہیں:

۱۔نقدِ میر ۲۔طیفِ نثر ۳۔طیف غزل ۴۔ولی سے اقبال تک ۵۔وجہی سے عبدالحق تک ۶۔سرسیّد اور اُن نام ور رفقا کی اُردو نثر کا فنی اور فکری جائزہ ۷۔اشاراتِ تنقید ۸۔اطرافِ غالب ۹۔سخن در (جلد اوّل، دوم) ۱۰۔کلچر کا مسئلہ وغیرہ۔

جیسے میں نے قبل ازیں ذکر کیا کہ میں نے اِن کتب سے بہت کچھ سیکھا اور سمجھا اِسی لیے میں ڈاکٹر سیّد عبداللہ کو Idealise کرتا رہا مگر جب میں اُن کی ایک تصنیف کا ازسرِ نو مطالعہ کر رہا تھا تو دورانِ مطالعہ ایک مقام پر آ کر میں ٹھٹھکا، چونکا اور حیران رہ گیا۔بے یقینی کے عالم میں، مَیں نے وہ صفحات دوبارہ پڑھے، سہ بارہ پڑھے۔یقین ہی نہیں آتا تھا کہ یہ صفحات ڈاکٹر سیّد عبداللہ کے تحریر کردہ ہیں؟ کیا یہ اُنھی کا اسلوب ہے؟ ان کے پیش کردہ دلائل سے نہ تو میں متاثر ہوا ہوں اور نہ ہی قائل۔ہاں یہ حقیقت ہے اِس سے میرا Idealism ضرور متاثر ہوا ہے۔آیئے! میں اپنی حیرانی میں آپ کو بھی شریک کرتا ہوں۔

میرے پیشِ نظر ڈاکٹر سیّد عبداللہ کی تصنیف بہ عنوان ''اشارتِ تنقید'' کی دوسری اشاعت (فروری ۱۹۹۳) ہے۔اِس کا تعارف ڈاکٹر صاحب نے ''گزارش'' کے عنوان سے تحریر کیا ہے جس کے آخر میں ۶ مئی ۱۹۶۶ء کی تاریخ درج ہے۔یہ ایک اہم تصنیف ہے جو تنقید کے موضوع پر عمدہ تعارف پیش کرتی ہے۔اِس میں تنقید کی تعریف متعین کرنے کے بعد مشرق اور مغرب کے معروف ناقدینِ فن کے

نظریات کو عمدگی سے متعارف کرایا گیا ہے۔اس کتاب کے آخر میں (صفحہ نمبر ۲۸۵) ایک ضمیمہ بہ عنوان ''قلم کے چراغ'' شامل ہے۔اِس میں ''مطالعۂ ادب (ذاتی روداد)'' کے ذیلی عنوان کے تحت ایک مختصر باب درج ہے۔اِس باب میں وہ ناول کے باب میں کیا کہتے ہیں۔آیئے! دیکھتے ہیں:

> ''یوں ناول کو بھی ایک فرضی کردار کی سوانحِ عمری کہیے، مگر عجیب اتفاق ہے کہ میں ناول سے عمر بھر مانوس نہیں ہو سکا اس لیے بہت کم ناول پڑھے ہیں اور جتنے پڑھے ہیں تدریسی ضرورتوں سے پڑھے ہیں۔
>
> ناول کے خلاف میرا تعصب بہ ظاہر غیر معقول معلوم ہوتا ہے مگر جب میں تجزیہ کرتا ہوں تو اِس کی ایک عقلی تعبیر (کم از کم اپنی تسلی کے لیے) موجود پاتا ہوں۔ میں عام صداقتوں کو تو مانتا ہوں مگر ان کے لیے فرضی کرداروں کی کیا ضرورت ہے؟ کیا خدا کی اِس بستی میں حقیقی کردار ایسے بہ کثرت موجود نہیں جن کے بارے میں وہ یقینی صداقتیں بالفعل موجود ہیں۔ میں واقعاتی صداقت کو فرضی صداقت پر ترجیح دیتا ہوں۔یہ افلاطون کے زیرِ اثر نہیں کہہ رہا ہوں بالکل اپنے ذائقے کی بنا پر کہہ رہا ہوں۔ناول کے کردار میں عمومی صداقتیں ہو سکتی ہیں مگر فن اپنی اثر آفرینی کے لیے مبالغے سے کام لینے پر مجبور ہو جاتا ہے اور ایب نارمل کردار ناول میں کچھ زیادہ ہی سجتے ہیں۔اِسی لیے قصے اور داستانیں بھی کبھی اچھی نہیں لگیں۔ یہ سچ ہے کہ اِس قسم کی ادبیات سے ہمارے جذبہ و تخیل کے کئی تشنہ تقاضوں کی تشفی ہوتی ہے مگر اس افسانوی اشتہا کو میں شاعری سے پر کر لیتا ہوں۔۔۔۔۔ہاں قصوں کا ایک خاص رنگ قابلِ توجہ ہے اور وہ اِن کی اخلاق آموزی، مگر جب میں واعظ بنوں گا تو ان قصوں سے کام لے لوں گا۔فی الحال میں واعظ بننے کا ارادہ نہیں رکھتا۔۔۔۔ذاتی طور پر میں تاریخ اور سوانح عمری دونوں کو ناول اور قصے سے افضل مانتا ہوں۔ ناول بعض انسانوں کے بدنما (اگرچہ مکمل) مجسّمے تیار کرتا ہے اور انسانیت کے خلاف سچائی کے نام پر شدید بدظنی پیدا کرتا ہے۔اس لیے ناول میں کبھی دل نہیں لگا۔''(۱)

یہ اقتباس پڑھنے کے بعد میری سمجھ میں یہ بات نہیں آتی کہ اِس تصنیف میں اس ضمیمے کا کیا جواز ہے؟ کیا اِس ضمیمے نے اِس تصنیف کے مجموعی تاثر اور حُسن کو متاثر نہیں کیا؟ ڈاکٹر سیّد عبداللہ خود بھی اِس حقیقت سے باخبر ہیں۔انھوں نے اِس ضمیمے کے آغاز میں ہی اس بات کا ذکر کیا ہے:

> ''یہ مطالعۂ ادب کی ذاتی روداد ہے۔میں نے یہ سلسلہ ''چٹان'' (ہفتہ وار) لاہور میں شروع کیا تھا۔۔۔ یہ چند مضامین۔۔۔ جانتا ہوں کہ یہ اصل کتاب سے

مطابقت نہیں رکھتے۔۔۔‘‘(۲)

ڈاکٹر سید عبداللہ اپنی اِس تحریر میں مدرسانہ پہلو کا ذکر کرتے ہیں:

> ’’اب تقاضا ہوا ہے کہ میں کم از کم اپنے مطالعہ واکتساب کی سرگزشت ہی لکھ ڈالوں۔ ہر چند کہ کام یہ بھی مشکل ہے مگر اِس ارشاد کی تعمیل کا ارادہ کرلیا ہے کیوں کہ اِس کام میں ایک مدرسانہ پہلو بھی ہے ___ اور مجھے مدرس بننے اور مدرس کہلوانے سے اب بھی خوشی ہوتی ہے۔‘‘ (۳)

کیا ڈاکٹر سیّد عبداللہ کی یہ تحریر واقعتاً ایک مدرسانہ تحریر ہے؟ کیا اس سے اُن کے مدرسانہ منصب اور مقصد کو گزند نہیں پہنچتا؟ کیا اس تحریر سے آنے والی نسلوں کے طالبانِ علم میں ناول سے تعصب منتقل نہیں ہوجائے گا؟ کیا وہ بھی ناول کی صنف سے متنفر نہ ہوجائیں گے؟ میرے نزدیک ڈاکٹر صاحب کے لیے اپنے اِن خیالات کا اظہار ضروری نہ تھا۔ یہ ٹھیک ہے کہ اُن کا میلانِ طبع ناول کی طرف نہیں تھا مگر ضروری تو نہیں کہ ہر بات کہہ دی جائے۔ کچھ باتیں تو خوفِ فسادِ خلق کے باعث، اَن کہی ہی رہیں تو زیادہ بہتر ہوتا ہے۔ اِسی تصنیف میں ایک جگہ ڈاکٹر سیّد عبداللہ ادب کی ایک جامع تعریف وضع کرتے نظر آتے ہیں:

> ’’ادب وہ فنِ لطیف ہے، جس کے ذریعے ادیب جذبات وافکار کو اپنے خاص نفسیاتی وشخصیاتی خصائص کے مطابق نہ صرف ظاہر کرتا ہے بل کہ الفاظ کے واسطے سے زندگی کے داخلی اور خارجی حقائق کی روشنی میں اُن کی ترجمانی وتنقید بھی کرتا ہے اور اپنے تخیل اور قوتِ مختر عہ سے کام لے کر اظہار وبیان کے ایسے مَسرت بخش حسین اور مؤثر پیرائے اختیار کرتا ہے جن سے سامع وقاری کا جذبہ وتخیل بھی تقریباً اسی طرح متاثر ہوتا ہے جس طرح خود ادیب کا اپنا تخیل اور جذبہ متاثر ہوا۔‘‘ (۴)

اگر ہم ناول کو مندرجہ بالا تعریف کی کسوٹی پر رکھ کر پرکھیں تو بہت سے سوالات اُبھرتے ہیں:

- کیا ناول کی صنف، ادب یا فنِ لطیف کے زمرے میں شامل نہیں ہے؟
- کیا ناول نگار ایک ادیب نہیں ہوتا؟
- کیا ناول نگار اپنے جذبات اور افکار کا اظہار نہیں کرتا؟
- کیا ناول الفاظ کے ایک خاص دروبست کا نام نہیں؟
- کیا ناول زندگی کے داخلی اور خارجی حقائق کی ترجمانی نہیں کرتا؟
- کیا ناول زندگی کے داخلی اور خارجی حقائق کی تنقید نہیں ہے؟
- کیا ناول، ناول نگار کے تخیل اور قوتِ مختر عہ کا شاہ کار نہیں ہوتا؟
- کیا ناول اظہار وبیان کے مسرت بخش، حسین اور موثر پیرایۂ اظہار کا نام نہیں ہے؟

- کیا ناول قارئین کے جذبہ وتخیل کو اُسی طرح متاثر نہیں کرتا کہ جیسے ناول نگار کو متاثر کرتا ہے؟

اگر ناول، ڈاکٹر صاحب کی وضع کردہ ادب کی تعریف پر پورا نہیں اترتا تو پھر اِس تعریف کی نفی ہوجاتی ہے۔

ناول، ادب کی ایک اہم صنفِ نثر ہے۔ ادب کو زندگی کا آئینہ، زندگی کا عکس کہا گیا ہے تو ناول میں بھی زندگی کا عکس نظر آتا ہے، ناول یقیناً زندگی کا آئینہ ہے۔ ناول میں ناول نگار مرکزی اور ذیلی کرداروں کے اقوال، افعال وکردار کے ذریعے زندگی کا ایک جیتا جاگتا مرقع پیش کرتا ہے۔ ناول کے بڑے کینوس پر زندگی اپنی تمام تر صداقتوں اور لطافتوں کے ساتھ جلوہ گر نظر آتی ہے۔ ناول، بنیادی طور پر ایک مغربی صنفِ نثر ہے، مگر اُردو ادب میں بھی اس صنف میں خاطر خواہ کام ہوا ہے۔ ڈاکٹر صاحب ناولوں میں واقعاتی صداقت کی عدم موجودگی کے شاکی ہیں۔ اگر یہ بات ہے تو پھر بہت سے کامیاب سوانحی ناول کس کھاتے میں جائیں گے۔ بہت سے ناولوں میں خوفِ فساد کے باعث کرداروں کے فرضی نام تجویز کیے جاتے ہیں ورنہ ان میں بیان کردہ واقعات میں بہت کچھ مبنی بر حقیقت ہوتا ہے۔ تخیلاتی رنگ کی آمیزش کسی بھی تخلیق کار کا ادبی حق ہوا کرتا ہے بل کہ حقیقت یہ ہے کہ یہ رنگ تو ہر صنفِ ادب کی جان ہے۔

ناول ہی کیا ہماری عام زندگی میں ایب نارمل کرداروں اور ایب نارمل صورتِ احوال کی کمی نہیں۔ ناول میں حقیقی زندگی سے بہت کچھ لے کر Paint کردیا جاتا ہے۔ یہ ٹھیک ہے کہ بہت سی تفاصیل کا بیان زیبِ داستان کے لیے ہوتا ہے مگر اس تکنیک سے ناول میں ہر حوالے اور ہر پہلو سے آخر تک دل چسپی برقرار رہتی ہے۔

اخلاق آموزی کسی بھی تخلیق کار کا مطمعِ نظر ہوتا ہے نہ ہونا چاہیے کیوں کہ ڈاکٹر سیّد عبداللہ ہی کے بہ قول غیر معتدل مقصدیت فن کے لیے مضر بل کہ مہلک ہوتی ہے(۵)۔ کوئی بھی تخلیق کار زندگی کے تمام روشن اور تاریک پہلوؤں کو سامنے لے آتا ہے۔ اب اس سے اخذ وقبول تو قاری کی اپنی استعداد پر منحصر ہے۔

شاعری میں بھی صنائع بدائع کے استعمال سے مبالغہ کی انتہا کردی جاتی ہے بل کہ روایت کی اندھی تقلید تو ادبی جُگالی بن جاتی ہے۔ اُردو شاعری سے صرف ایک مثال ہی دوں گا کہ کیا ’’شاعرِ خمریات‘‘ کی شاعری فرضی صداقت کے زمرے میں نہیں آتی؟

اس مختصر مضمون کی تسوید کے پسِ منظر میں کسی بھی قسم کا کوئی بھی تعصب ہرگز کارفرما نہیں ہے۔ پھر اس کا مقصد مخالفت برائے مخالفت بھی نہیں یہ تو میرے تاثر کا ایک ردِعمل ہے اور میں اپنے اس ردِعمل میں دوسرے قارئین کو بھی شریک کرنا چاہتا ہوں۔ اس بحث کا اختتام میں ممتاز حسین کی رائے سے کروں گا۔ آیئے! دیکھتے ہیں کہ وہ ناول کے حوالے سے کیا کہتے ہیں:

"علمی کتابیں تو بے شمار موضوعات پر لکھی جا سکتی ہیں لیکن ناول کا موضوع ایک ہی ہوتا ہے اور وہ ہے زندگی۔"(۴)

حوالہ جات:

۱۔ ڈاکٹر سیّد عبداللہ، اشاراتِ تنقید، مقتدرہ قومی زبان، اسلام آباد، ۱۹۹۳ء، ص ۲۹۰، ۲۹۱۔

۲۔ ایضاً ص ۲۸۵۔

۳۔ ایضاً ص ۲۸۶۔

۴۔ ایضاً ص ۲۴۷، ۲۴۸۔

۵۔ ڈاکٹر سیّد عبداللہ، سرسید احمد خان اور اُن کے نام ور رفقا، مقتدرہ قومی زبان، اسلام آباد، ۱۹۸۹ء، ص ۲۲۲۔

۶۔ ابوالاعجاز حفیظ صدّیقی کشاف، تنقیدی اصطلاحات، مقتدرہ قومی زبان، اسلام آباد، ۱۹۸۵ء، ص ۱۹۲۔

☆☆☆

سیمین دانشور / رشید قیصرانی

ایکسیڈینٹ

(ایرانی کہانی کا اُردو روپ)

ہماری بدبختی اس وقت شروع ہوئی جب ہماری ہمسائی صدیقہ خانم نے کار خریدی۔ ہم نے صبح سویرے اُسے سفید دستانے اور سیاہ عینک پہنے، سٹیرنگ ویل سنبھالے دیکھا۔

اس نے تکلفاً سوار ہونے کے لیے کہا۔ سوار ہوئے بغیر مجھے بعدازظہر پیش آنے والے حوادث کا احساس ہو گیا اور میں نے ان سے بچنے کے لیے کلمہ شہادت پڑھا۔ پھر جب دفتر سے گھر آیا تو دیکھا کہ بیگم منہ پھلائے ہوئے ہے۔ میری باتوں کا مختصر جواب ہاں یا نہ میں دے رہی ہے۔ وہی عورت کہ جب میں گھر آتا کہا کرتی "سنو! میں تمہیں آج کی رپورٹ سناؤں، خواہ سنو یا نہ سنو میں تو اپنی بات سناؤں گی لہٰذا اپنی بے عزتی نہ کراؤ اور سنو" اور بتایا کرتی "آج میں نے جو قدم بھی اٹھایا تو ایک حادثہ پیش آیا"۔ "صدیقہ خانم نے اِس طرح کیا" اور "صدیقہ خانم نے اُس طرح کیا" لیکن اس دن بیگم کا رویہ ایک روبوٹ کی طرح تھا۔ وہ کھانا لائی اور میں نے خاموشی سے کھایا اس نے پہلی مرتبہ سگریٹ سلگایا، اناڑیوں کی طرح منہ میں اڑس لیا پھر کہا "سیدھے بیٹھ جاؤ تاکہ میں جناب کی خدمت میں کچھ کہوں" میں سیدھا بیٹھ گیا اور صدیقہ کی کار کا خیال آیا تو میرا دل ڈوبنے لگا۔ "میرے لیے کار خریدو اور تم خود جانتے ہو کہ یہ تم خریدو گے۔"

میں نے کہا "جان! فلمی اداکاروں کی طرح کیوں ڈائیلاگ بول رہی ہو؟" اس نے کہا "انجان نہ بنو، کار کب خرید رہے ہو؟" میں نے کہا "تمہیں تو ڈرائیونگ ہی نہیں آتی۔" کہنے لگی "میں نے صدیقہ خانم سے بنیادی معلومات حاصل کر لی ہیں۔ گاڑی چلانے کی مشق سے لے کر لائسنس حاصل کرنے تک کا خرچ پانچ سو تومان ہے۔ یہ رقم تم اپنے ادارے سے ایڈوانس لے لو، اگر ہم قسطوں میں گاڑی لیتے ہیں تو اس کا فائدہ نہیں ہے لیکن اگر نقد خریدیں تو صرف بتیس ہزار/-32000 تومان لگتے ہیں۔ سیکنڈ ہینڈ سستی ملتی ہے لیکن اس میں نقصان ہے۔ یہ تیل پینا شروع کر دیتی ہے اور ہمیشہ ورکشاپ جاتی رہتی ہے تم تو ماشاءاللہ بیوی کے لیے ایک قدم اٹھانے کی زحمت گوارا نہیں کرتے، ہر وقت مجھے ہی باہر جانا پڑے گا۔ میں ہی شرمندہ ہوں گی اور میری ہی سبکی ہوگی۔ نئی گاڑی خریدو۔"

پھر پہلے والی بیوی بن گئی۔ سچی بات ہے کہ مجھے اپنی ساری زندگی میں، باتونی، خوش خوراک، پرکشش اور باذوق عورتیں پسند تھیں اور میں نے نادرہ سے بھی اسی وجہ سے شادی کی تھی۔ البتہ جس وقت میں نے اس سے شادی کی تھی وہ نادرہ تھی لیکن نکاح کے وقت اس نے ضد کر کے اپنا نام تبدیل کرایا اور نادیا لکھوایا۔

میں نے کہا "بیگم! تم جانتی ہو کہ بتیس ہزار تومان کہنا آسان ہے۔ اتنی رقم میں کہاں سے

لاؤں۔ تمھیں معلوم ہے کہ میری تنخواہ سے تو مہینے کا خرچ ہی پورا ہوتا ہے۔ ایک کوڑی کی بچت بھی نہیں ہے۔ سکول جانے والے دو بچوں اور آنے جانے کا خرچ۔۔۔۔۔''

میں کہہ تو بیٹھا لیکن اب معاملہ ہاتھ سے نکل چکا تھا۔ بیگم نے کہا ''ہاں جناب! میں بھی اس آمدورفت کے خرچ کے لیے گاڑی خرید رہی ہوں۔ تمھیں صبح دفتر لے جاؤں گی اور دوپہر کو واپس لے آؤں گی۔ بچوں کو سکول لے جاؤں گی۔۔۔ اس طرح ہمارا خرچ کم ہو جائے گا۔''

میں نے کہا ''بیگم! تمھاری مت ماری گئی ہے۔ یہ تو ایسے ہے جیسے ایک کے پاس کھانے کے لیے روٹی ہی نہیں تھی لیکن اس نے پیاز رکھنے کے لیے کمرے کا سامان باہر نکال پھینکا۔''

بیگم نے کہا ''کمرہ تو تھا۔۔۔ کمرہ گروی رکھ دیتا۔ ہم بھی اپنا گھر گروی رکھ سکتے ہیں۔ اس دنیا میں اگر آدمی کے پاس کار ہے تو سب کچھ ہے۔ مالی ادارے سے وابستہ ہو اور سب اونچ نیچ سے واقف ہو۔'' میں نے کہا ''بیگم! ہماری تمام جمع پونجی یہی ایک مکان ہے تمھیں کیا پتہ کہ والد مرحوم نے پیٹ پر پتھر باندھ کر یہ گھر بنایا تھا۔ اگر اسے گروی رکھ دیں تو رقم کہاں سے لائیں گے کہ اسے چھڑائیں گے۔''

بیگم نے کہا ''اللہ تعالیٰ کریم ہے اس وقت تک۔۔۔'' اس نے گلا تر کیا اور کہا ''دیکھو جان! کیا میں نے تم سے وائٹ ہاؤس مانگا ہے، یورپ کی سیاحت کا مطالبہ کیا ہے؟ حتیٰ کہ تم نے تو میرے لیے شادی کے ایک مناسب جشن کا اہتمام بھی نہیں کیا تھا۔ دلہنوں والے سفید اور جالی دار سفید نقاب کی حسرت میرے دل میں رہی۔'' اس نے کچھ دیر سوچا اور پھر شروع ہو گئی، ''مجھے یاد ہے کہ مجھے سردی لگ گئی تھی اور میں نے تمھیں کہا تھا کہ مجھے ایک چرمی اوورکوٹ خرید دو' تو تم نے جواب دیا تھا کہ ''کریسیڈین ڈی کھالو' اور پھر ہونٹ سی لیے۔ اس لیے کہ رونا نہ شروع کر دے میں نے کہا ''چھوڑو تھوڑا آرام کر لیں اور بعد میں سوچیں گے اور دیکھیں گے کیا کرنا چاہیے شاید تمھارے لیے قسطوں پر ایک کار خریدوں۔''

کہنے لگی ''قسط؟ بغیر قسط، پھر ہم قسط کے غلام بن جائیں گے۔ اخراجات کے غلام تو ہیں ہی قسط کے غلام بھی ہو جائیں۔'' یہ الفاظ اس کے اپنے الفاظ نہیں تھے، صدیقہ خانم کے زیادہ تھے۔ یعنی اس کی روح بیگم میں حلول کر گئی تھی۔۔۔ یعنی خدا نہ کرے میری بیوی۔۔۔ میں گونگا ہو جاؤں۔''

پھر کہا ''کیوں سوچ میں ڈوب گئے ہو، پیارے مکان کا فکر نہ کرو۔۔۔۔ خدا میرے والد کو زندہ رکھے لیکن وہ نوح کی عمر کا مالک تو نہیں آخر ''بہمنی نخلستان'' مجھے ہی ملیں گے۔ ''شاہراہِ پہلوی'' پر ایک اچھا سا گھر خریدیں گے، میں نے سوچ رکھا ہے ''زعفرانیہ' یا ''باغ فردوس'' کے پچھواڑے میں۔''

میری بیوی ''اہواز'' کا تحفہ تھی۔ ۴۰ء کی عید پر میں دوستوں کے ہمراہ اہواز گیا تھا شہر کے قابلِ دید مقامات اسی دن دیکھ لیے اور رات کو آزاد تھے کہ کیا کریں۔ آخر ہم نے جرات کی اور سینما چلے گئے۔ سکول کی لڑکیوں کا ایک گروہ ہم سے آگے بیٹھا تھا وہ لڑکیاں پیچھے مڑ کر دیکھتیں، غور سے ہمارا جائزہ لیتیں اور ہنسی کے مارے لوٹ پوٹ ہو جاتیں سوائے ۴۰ء والی نادرہ اور موجودہ نادیہ کے جس نے پیچھے مڑ کر بالکل نہ

دیکھا۔ نہ تو ہم نے فلم دیکھی اور نہ ہی سکول کی لڑکیوں نے۔ ترانہ، آٹومیٹک ریزر، پیپسی کے اشتہارات اور آیندہ پروگرام کی جھلکیاں دکھانے کے بعد فلم اچانک بند کر دی گئی اور بتیاں روشن ہو گئیں۔ تھوڑی دیر کے بعد از سرِ نو ترانہ، اشتہار۔۔۔ اور یہ سلسلہ جاری تھا کہ فلم دوبارہ بند ہو گئی اور پھر نئے سرے سے شروع کی گئی اس طرح تین مرتبہ ہوا۔ تیسری دفعہ نادرہ اٹھ کھڑی ہوئی اور نعرہ لگایا مسخرہ بازی کرتے ہو۔ دنیا میں کسی جگہ بھی نوواردوں کے لیے فلم دوبارہ شروع سے نہیں چلائی جاتی''۔ اس کی آواز ریڈیو تہران سے گیت گانے والے کسی فنکار کی آواز کی طرح تھی یا پھر اس نے اس فنکار کی آواز کی پریکٹس کی ہوئی تھی۔ لمبی بات کیا کروں پھر ہم بھی شیر ہو گئے اور سکول کی لڑکیوں کے ساتھ نعرے لگانے اور سیٹیاں بجانی شروع کر دیں۔ فلم منسوخ ہو گئی۔ ہم سب کو پیدل تھانے لے گئے۔ تھانے میں آفیسر انچارج ہمیں دیکھ کر خوشی سے باغ و بہار ہو گیا۔ معلوم ہوا کہ ہر مرتبہ میئر، ڈی سی اور ایس پی کے مہمانوں کے لیے فلم از سرِ نو شروع کی جاتی تھی۔

میں نے بیوی سے کہا ''بہتر یہ ہے کہ باپ کو ایک رقعہ بھیج دو کہ علی الحساب۔۔۔'' کہ وہ پھٹ پڑی، اگر اب نہ روئے تو کب روئے۔ اسے خاموش کرانے کے لیے میں نے کہا ''ہم نے مان لیا کہ کار خریدی گئی لیکن اس گھٹیا گھر میں جس میں گیراج بھی نہیں ہے تم کار کہاں کھڑی کرو گی؟'' اس نے اپنے آنسو پونچھے اور کہا ''میں جانتی تھی کہ تو کار خریدے گا تو ایک اچھا مرد ہے صرف بزدل ہے۔ میں نے پارکنگ کی جگہ بھی سوچ رکھی ہے میں ایک زنجیر خرید لیتی ہوں اور اپنے گھر کے سامنے والے بجلی کے سیمنٹ والے کھمبے سے باندھ دیں گے۔ پہلا کھمبا ہماری کار کے لیے اور دوسرا کھمبا صدیقہ خانم کی کار کے لیے۔''

جب سے میں نے کار خریدنے کی ہامی بھری تھی اس کو تین ہفتے گزر گئے، میں نے دیکھا کہ وہ اداس رہتی ہے، کھانا پینا چھوٹ گیا ہے، کمرے کی کھڑکی سے پیٹھ لگائے گلی کی طرف منہ کیے صدیقہ خانم کی گاڑی کو حسرت بھری نگاہوں سے دیکھتی اور آہیں بھرتی رہتی ہے۔ میں نے دفتر سے پانچ سو تومان قرض لیے اور بیگم ڈرائیونگ سیکھنے جانے لگی اور پھر ڈرائیونگ لائسنس حاصل کرنے کی نوبت آئی۔ میں نے والدہ کے حکم کے مطابق ایک کتاب مفاتیح الجنان خریدی اسے شروع سے آخر تک کھنگال ڈالا تاکہ ایک ایسی دعا مل جائے جس سے ڈرائیونگ ٹسٹ لینے والے نرم ہو جائیں۔ معلوم ہوا کہ اس قسم کی دعا نہ تو مفاتیح الجنان میں ہے اور نہ ہی کسی دوسری دعاؤں کی کتاب میں والدہ نے مجھے یہ یاد کرایا کہ میں ''صم بکم عمی فھم لایعقلون'' کا ورد کروں اور بیوی پر پھونک دوں۔ میں نے یہ ''کام'' سو مرتبہ پہلے بھی کیا تھا۔ خود والدہ نے ایک ختم قرآن پڑھوایا اور منت مانی کہ اگر یہ شیطان جس کا نام کار ہے اور میری بیوی کو چمٹ گیا ہے، اگر اس کی جان چھوڑ دے تو وہ ابوالفضل کے نام سے دیگ چڑھائے گی لیکن معلوم ہوا کہ اس قسم کے کسی شیطان کو نکالا نہیں جا سکتا کیونکہ بیگم ڈرائیونگ کے تحریری امتحان میں کامیاب ہو چکی تھی۔ وہ خود بتاتی تھی کہ ٹیسٹ کے تمام سوالات پر میں نے صحیح نشانات لگائے تھے۔ کپتان صاحب خوش ہو گئے اور مجھے کہا ''خانم آپ نے جنوب کی تمام دھوپ ذخیرہ کی ہوئی ہے۔'' کیونکہ بیگم خاصی سانولی ہے۔

اور پھر کپتان نے پوچھا ''اگر برف باری ہو چکی ہو، سڑک پر برف جم گئی ہو اور اترائی کے وقت گیر Gear لگاؤ اور گیر نہ لگے تو کیا کرو گی۔'' تو میں نے کہا ''جنابِ محترم! میں ایسے موسم میں اپنی نازنین کار کو گیراج ہی سے نہیں نکالوں گی۔'' کپتان صاحب ہنسی کے مارے لوٹ پوٹ ہو گیا۔ سنگ چین کے امتحان میں کامیاب ہو گئی۔ وہ کہتی تھی ''اکبر صاحب، مالکِ ''فاکسی''، جس کار سے اس نے امتحان دیا تھا، نے موڑ پر سیاہی کا ایک نشان لگایا ہوا تھا اور جیسے ہی میں وہاں پہنچی تو میں نے ایک ملی میٹر پہلے کار موڑ لی'' میں نے اسے پانچ تومان انعام دیا۔

میں ماں کی نذر و نیاز کی وجہ سے پر امید ہوتا جا رہا تھا کیوں کہ بیگم رکاوٹوں کے درمیان پارکنگ کے امتحان میں تین مرتبہ فیل ہو چکی تھی۔ پہلی مرتبہ تمام رکاوٹوں کو تہ و بالا کر دیا تھا۔ دوسری مرتبہ رکاوٹوں کے درمیان میں سے گزر تو آئی لیکن واپس نہ نکل سکی۔ تیسری مرتبہ کپتان صاحب سے جھگڑا ہو گیا البتہ یہ کپتان ''جنوب کی دھوپ'' والا کپتان نہیں تھا۔ کئی قسم کے کپتان موجود تھے۔ بیگم نے رکاوٹوں میں پارکنگ کا امتحان لینے والے کپتان سے کہا ''چونکہ تمہارا قد ٹھگنا ہے اور تمہیں کمپلیکس (احساسِ کمتری) ہے۔ اس لیے لوگوں کو خواہ مخواہ فیل کرتے ہو۔'' اس قسم کی معلومات ریڈیو تہران سے حاصل شدہ تھیں کیونکہ صبح سے شام تک وہ ریڈیو کان سے لگائے رہتی تھی۔ کپتان صاحب نے چوتھا امتحان دو ہفتہ کے بعد مقرر کیا تھا۔ ''اس ستون سے اس ستون تک خوشحالی ہے'' کے مصداق میرے قدم زمین پر نہیں ٹکتے تھے خیر چوتھے امتحان میں وہ پاس ہو گئی۔

اب شہر میں امتحان کی باری آ گئی۔ چھ مرتبہ فیل ہوئی۔ پہلی مرتبہ چلنے کا اشارہ نہ کیا دوسری مرتبہ شیشہ ہی نہ دیکھا، تیسری مرتبہ ہینڈ بریک نہ کھینچی چوتھی مرتبہ کپتان صاحب سے دھوکہ کھا گئی اور اس کے حکم پر چوک سے ایک قدم پہلے گاڑی روک لی۔ پانچویں مرتبہ تیز رفتاری سے بائیں طرف سے مڑ کر ایک اور کار کراس کر لیا۔ چھٹی مرتبہ پورا زور لگانے کے باوجود گاڑی سٹارٹ نہ کر سکی۔ ساتویں مرتبہ معجزہ ہوا اور وہ پاس کو ہو گئی۔

پہلے دن صبح سویرے جاگی۔ (خوبصورت کپڑے اور جوتے پہنے) بنفشی رنگ کی لپ سٹک لگائی، بنفشی رنگ کے پھولوں والا سفید دوپٹہ سر پر اوڑھا سیاہ عینک لگائی اور سفید دستانے پہنے۔ میں اس کی ساتھ والی سیٹ پر بیٹھا جبکہ بچوں کو حکم دیا کہ وہ کھڑے ہو کر ہمارے جانے کا نظارہ کریں اور میرے دفتر کی طرف روانہ ہوئی۔ وہ کار میں لگے آئینہ میں بار بار بس ڈرائیور، ٹیکسی ڈرائیور، پیدل چلنے والوں کو دیکھتی خاص طور پر پردہ دار چادر پوش عورتوں کو، ان پر آوازے کستی اور ان کا مذاق اڑاتی۔ میرے معدہ میں جلن ہونا شروع ہو گئی۔ دفتر پہنچنے تک میرا دل، انتڑیاں سب کچھ درہم برہم ہو گیا تھا اور میرے دل میں ایسا درد اٹھا کہ مت پوچھو۔ میں پندرہ منٹ لیٹ پہنچا تھا اور معدہ کے زخم نے بھی درد کرنا شروع کر دیا تھا۔ ظہر کے بعد وہ پھر میرے پیچھے آئی مجھے لینے کے لیے۔ مجبوراً میں سوار ہو گیا میرے دل نے تیز دھڑکنا شروع کر

دیا۔ خاص طور پر پہلے کی طرح بائیں طرف اچھلنا۔

خیابان اسلامبول کے چوک پر بیگم صاحبہ نے مڑنے کا اشارہ کرنے کے لیے اپنا بایاں ہاتھ باہر نکالا، ایک غنڈہ نے اس کی کلائی مضبوطی سے پکڑ لی۔ پہلے تو ڈرائیوروں کی طرح نہیں، کنڈکٹروں کی طرت اس بدمعاش سے تو تکار کی پھر ہاتھ چھوڑنے کا کہا اور آخر میں منت سماجت کرنے لگی اور اس بے حیا نے کہا ''آخر تم کہاں کی چیز ہو'' سبز بتی جل اٹھی اور ہمارا راستہ کھل گیا اب وہ کمینہ مرد ہاتھ بھی تو چھوڑے۔ بیوی مجھے حوصلہ رکھنے اور برداشت کرنے کی تلقین کر رہی تھی کہ اس قسم کے واقعات ڈرائیونگ میں پیش آ جاتے ہیں۔ ہمارے پیچھے والی کاریں اس قدر ہارن بجا رہی تھیں کہ الامان۔ ایسے لگتا تھا جیسے ابھی ایٹم بم دریافت کرنے جا رہے ہیں اور وہ کمینہ بیگم کا ہاتھ نہیں چھوڑ رہا تھا اور میرا دل گھڑی کے لیے دھک دھک کر رہا تھا جو کہ اگرچہ اب وقت نہیں بتاتی تھی لیکن تھی تو سونے کی۔ میں اتر کر اس غنڈہ سے گتھم گتھا ہونا چاہتا تھا لیکن دوسری کاریں میرے کان کے نزدیک سے بجلی کی سی تیزی سے گزر رہی تھیں اور میں وہ آدمی ہوں جو پارک شدہ کاروں سے بھی ڈرتا ہوں کہ کہیں کھڑے کھڑے نہ چل پڑیں۔

چونکہ مجھے دفتر لے جانا اور واپس لانا اس نے اپنا فرض سمجھ لیا تھا اور میں اس کے اِس احساس فرض کو کسی طور بھی ختم کرنے میں کامیاب نہ ہو سکا۔ میرے بدن کے تمام اجزاء مجھے خطرے سے آگاہ کر رہے تھے اور میری غیرت کی رگ بھی مسلسل پھڑکتی رہتی تھی اور سب سے اہم بات یہ تھی کہ میرا خرچ بھی پورا نہیں ہو رہا تھا۔ اِدھر اُدھر بہت پاؤں مارے آخر کار مجھے ایک contract مل گیا اور میں ''دشت میشان'' چلا گیا۔

اس کے تمام خطوط اس کی ڈرائیونگ کے واقعات سے پر ہوتے تھے۔ وہ سب میرے پاس ہیں اور اس وقت میرے سامنے ہیں۔ ''پیارے میں کل ''نادری'' گئی تھی تاکہ اپنے کپڑے لے آؤں۔ کپڑے میں نے رنگ کرنے کے لیے دیئے تھے کیونکہ جلد نئے کپڑے ملنے کی امید تو ہے نہیں اور تمہاری پچھلے مہینے کی تنخواہ میں سے دیر سے آنے کی وجہ سے پینتالیس تومان اور تین ریال کاٹ لیے گئے ہیں۔ بھکاریوں کے سر میں دھول جھونکتے ہیں۔ ہاں تو میں نے کہا ''نادری'' گئی تھی۔ سفارت خانہ کی دیوار کے ساتھ گاڑی پارک کی۔ نہ میرے سامنے کوئی کار تھی اور نہ ہی میرے عقب میں۔ کپڑے ابھی تیار نہیں ہوئے تھے تو میں ونڈو شاپنگ کرنے چلی گئی۔ راستے میں بلاوز کی سیل (Sale) لگی ہوئی تھی۔ آج کل ہیر رِنگ Hairring کا فیشن ہے یہ نیم دائرہ میں کپڑے اور کپاس کا بنا ہوا رِنگ ہے، ڈرائیور کے لیے بہت اچھا ہے یہ بالوں پر لگا لیتے ہیں اور اس سے بال اڑتے اور بکھرتے نہیں ہیں۔''

''۔۔ میں نے اپنے کپڑے لیے اور واپس لوٹی۔ میری گاڑی سے آگے ایک لمبی کیڈلک پارک کر دی گئی تھی اور ایک پھیپھڑ فاکسی میری گاڑی کے پیچھے۔ میں نے خطرہ مول لیا اور سٹیرنگ سنبھالا۔ پتہ نہیں کہ میں نے کیا کیا کہ میری گاڑی کا اگلا بمپر دائیں طرف سے کیڈلک کے پچھلے بمپر سے اور میری گاڑی کا پچھلا بمپر فاکسی کے اگلے بمپر کے ساتھ پیوست ہو گیا۔ اب میں گاڑی کو ہلا بھی نہیں سکتی تھی۔ میں اتر کر باہر

آئی۔سکولوں کو چھٹی ہوگئی تھی اور اس علاقے کے سکولوں کے لڑکوں کے گروہ سڑکوں پر امنڈ آئے تھے۔ان میں سے ہر ایک مجھ پر آوازے کس رہا تھا۔ان میں سے ایک نے کہا ''حسین عورت ہمیں ایک گانا تو سناؤ۔''

۔۔۔۔سامنے ایک گاڑی کے شریف آدمی کو بلایا۔وہ اسی وقت اترا اور میری مدد کو آیا۔اس نے کہا کہ بدقسمتی سے بمپر سے بمپر ملا ہوا ہے۔اس نے دو تین مزدور پیشہ لوگوں کو بلایا اور وہ دو تین قلی لے آئے۔یا علی مدد کا نعرہ لگا کر انہوں نے فاکسی کو زمین سے اٹھایا اور میری پیجو سے کچھ فاصلے پر رکھ دیا۔معلوم کس طرح میں نے گاڑی زیادہ پیچھے کر لی اور وہ فاکسی سے ٹکرا گئی یہ گاڑی تو گتے کی بنی ہوئی ہے۔وہ چرنا مر ہوگئی ہے۔میں نے کارڈ نکالا اور اس پر اپنا پتہ لکھا اور فاکسی کے سامنے والے شیشہ پر لگا دیا۔خدا کرے کہ فاکسی کا مالک میرے پیچھے نہ آئے۔

عزیزم فاکسی کا مالک ظاہر نہ ہوا۔صدیقہ خانم کہتی ہے کہ اسے یقین نہیں آیا ہوگا کہ میں نے اپنا پتہ صحیح لکھا ہوگا۔۔۔۔کیونکہ کوئی احمق بھی ایسا کام نہیں کرتا جو تم نے کیا تھا۔پرسوں میں نے اس فاکسی کے مالک کے نہ آنے پر مٹھائی بانٹی ہے کہ یہ معاملہ بخیریت گزر گیا۔میں عباس آباد سے آ رہی تھی، میں نے دیکھا کہ سامنے سے آنے والی ہر گاڑی بتیاں جلا کر مجھے متوجہ کر رہی ہے میں نے سوچا شاید مجھ سے سلام دعا کر رہے ہیں میں نے بھی جواباً وائپر چلانے شروع کر دیئے اب مت پوچھو آگے راستہ بند تھا۔چوراستے پر پہنچ کر مجھ پر یہ حقیقت منکشف ہوئی۔اب میں کس مشکل سے واپس مڑی۔تمہیں کیا معلوم تم تو ڈرائیونگ نہیں جانتے۔میں نے ذرا لمبا موڑ کاٹا تو سڑک پر کھڑی ایک لاوارث فوکسی سے ٹکرائی۔مت پوچھو کیونکہ یہ گاڑی بند ہوگئی تھی اور جیسے ہی میں نے اسے ٹکر ماری وہ سٹارٹ ہوگئی لیکن مجھے اس بات کا علم نہیں تھا۔ٹکر مارنے کی وجہ سے مرا دل ڈوب گیا تھا کہ اب میں نقصان کی رقم کہاں سے لاؤں گی کہ اسے ادا کروں۔اس سڑک پر قصر چوک پر پہنچی تو سرخ بتی روشن تھی بدقسمتی سے اسی فوکسی کے پہلو میں جا رکی۔جیسے ہی فوکسی کے مالک نے اپنی گاڑی کا شیشہ نیچے کیا تو میں نے اپنے آپ سے کہا اے غافل دل ابھی یہ تم سے اپنی گاڑی کا نقصان طلب کرے گا۔لیکن اس نے فوراً شکریہ ادا کیا۔میری چھٹی حِس نے مجھے خبردار کیا کہ اصل معاملہ کیا ہے ورنہ میں آداب بجالاتی اور معذرت کرتی۔ہم گاڑی ڈرائیو کرنے والوں کو ایک دوسرے کی مدد کرنی چاہیے۔جب یہ اپنی منزل پر پہنچے گا تو اسے معلوم ہوگا کہ میں نے اس پر کیا بلا ڈالی ہے لیکن اس وقت تک اس کے ہاتھ سے موقعہ نکل چکا ہوگا۔

''۔۔۔۔پیارے سچی بات ہے، میں گھر میں ''فوجی انقلاب'' لانے پر مجبور ہوگئی، وہ میز جس پر شیشہ تھا اور وہ روز بروز ٹوٹتا جا رہا تھا، وہ آرام کرسی، جس کے نیچے اور دروازے تک غالیچہ بچھا تھا، وہ غالیچہ بھی جواب از کار رفتہ ہو چکا تھا، میں نے -/360 تومان میں بیچ دیئے۔کیا تمہیں پتہ ہے کہ میں دستی بریک اپنی جگہ پر واپس لانا بھول گئی اور اسی حالت میں ہی تمہاری خالہ سے ملنے ''ورامین'' چل پڑی، میں تم پر احسان نہیں جتا رہی تھی بلکہ پریکٹس کے نقطۂ نظر سے جا رہی تھی تاکہ سٹیرنگ پر میرا ہاتھ مضبوط ہو

جائے۔بریک اور بیرنگ وغیرہ برباد ہوگئے اور -/350 تومان انہی پر خرچ ہوگئے۔'' میرا ٹھیکہ ختم ہوگیا تھا اور میں واپس تہران لوٹ آیا۔ مجھے پتہ تھا کہ گھر مجھے خالی ملے گا کیونکہ بیوی کے ''فوجی انقلابات'' خطرناک تھے۔میری بیوی سمت تلاش کرنے میں خاصی کمزور تھی۔اس کے ڈرائیونگ سیکھنے کے دنوں میں مَیں اس کے لئے تہران کا نقشہ لے آیا تھا لیکن اسے کسی بھی طرح سے نقشہ سمجھ نہیں آتا تھا۔لیکن مجھے سمجھ آ گئی تھی کہ اسے چاروں سمتوں کا بھی علم نہیں ہے۔میں نے کوشش کی سورج اور اس کی حرکات سے کم از کم اسے شمال ہی یاد رہ جائے۔میں نے اس کے بازو لمبے کر کے اور شمال کی طرف منہ کر کے کھڑا کیا اور اسے کہا اب تمہارے دائیں طرف مشرق اور بائیں طرف مغرب ہے، سامنے شمال اور پیچھے جنوب ہے، اسی ترتیب سے جیسے ہمیں چھٹی جماعت میں یاد کرایا گیا تھا۔اس نے کہا پیارے، رات کو تو سورج نہیں ہوتا اور اس کے علاوہ ان دنوں میں کیا کروں گی جب بادل ہوں گے؟ رات کے مسئلہ کا حل تو میں نے دب اکبر سے نکالا لیکن اسے کسی دب کی سمجھ نہیں آتی تھی نہ اصغر کی اور نہ اکبر کی۔میں نے وضاحت کی کہ قبلہ جنوب کی طرف ہے اسی لئے مساجد شمالاً جنوباً بنائی جاتی ہیں لیکن میری بیوی نے تو ساری عمر نماز ہی نہیں پڑھی تھی۔میں نے مزید وضاحت کی ''کلیسا'' کا رخ شرقاً غرباً ہوتا ہے لیکن مصیبت یہ تھی کہ ہر سڑک پر کلیسا نہیں تھے۔آخر کار میں نے اس کے تجسس کو ابھارنے کی کوشش کی اور کہا پتہ نہیں میں نے کہیں پڑھا تھا یا سنا تھا یا ویسے ہی مجھے کشف ہوا تھا کہ چیونٹیاں اپنے بل شمال کے رُخ بناتی ہیں۔اس ایک بات پر بہت خوشی ہوئی، ڈرائیونگ کے نقطۂ نظر سے نہیں، ویسے ہی۔ہم جہاں کہیں بھی جاتے وہ چیونٹیوں کے نقش پا پر چلتی کہ ہم شمال کی طرف جا رہے ہیں کیونکہ چیونٹیاں اپنے گھر کے رخ شمال کی طرف رکھتی ہیں۔میں اس کے لئے ایک جنگی قطب نما خرید لایا لیکن اس نے اس سے کھیل کھیل کر اور ہاتھ پھیر پھیر کر اسے ناکارہ کر دیا تھا۔

میں گھر پہنچا۔بیوی اور بچے کمزور ہو کر مکڑی کی مانند پتلے نظر آ رہے تھے۔کار کے بارے میں بیوی کی وضاحتیں اس قدر فنی ہوگئی تھیں جو میری سمجھ سے بالاتر تھیں مثلاً بال بیرنگ ٹک گئے، خوبصورت ٹریڈ مارک ٹکڑے ٹکڑے ہو گیا، ڈائنامو کرنٹ چھوڑ گیا، کلچ پلیٹ جل گئی اور سب باتیں ایسی ہی۔۔۔۔بیگم، بچوں کو سکول پہنچاتی تھی اور پھر واپس آتے ہی امریکی طرز کی پتلون پہن لیتی، سرخ رنگ کی پلاسٹک کی بالٹی جو وہ خرید لائی تھی، پانی سے بھر لیتی۔اس میں واشنگ پوڈر ڈالتی، ہاتھوں پر پلاسٹک کے دستانے چڑھا کر کار کے سر ہو جاتی اور اب نہ دھوئے تو کب دھوئے۔ساتھ ساتھ گا بھی رہی ہوتی تھی۔کار دھونے والے ملازم سے بھی وہ زیادہ ماہر ہو چکی تھی۔گاڑی کو اتنا چمکاتی کہ اس میں اپنی صورت بھی دیکھ سکتی تھی۔گاری کے لئے ایک ریڈیو بھی خرید لائی تھی، چھت کا پنکھا بیچ کر: ''سخت سردیوں میں پنکھے کی کیا ضرورت ہے؟ خاص طور پر گرمیوں سے پہلے۔''

میں نے بیوی سے کافی لڑائی جھگڑا کیا حتیٰ کہ اسے ڈنڈوں سے پیٹنے کا ارادہ کیا لیکن وہ کس قدر کمزور نظر آ رہی تھی اس کی آنکھیں اندر کو دھنسی ہوئی تھیں اور اس کی رنگ کی ہوئی قمیض اس کے بدن پر

ایسے تھی جیسے وہ ہینگر پر لٹک رہی ہو، یہ دیکھ کر مجھے اس پر رحم آ گیا۔ پھر میں دوبارہ نئے ٹھیکے کی تلاش میں سرگرداں ہو گیا اور بہت دوڑ دھوپ کی اور شاید اسی غم میں بیمار پڑ گیا۔ گھر میں بیوی نے میری تیمارداری میں کوئی کسر نہ چھوڑی۔ والدہ صبح سویرے ''پاقاپق'' سے آتی اور میرے لئے سوپ تیار کرتی۔ شام کو میری بیوی اسے واپس چھوڑنے جاتی اور جب واپس آتی تو کار کی چابی انگلیوں میں نچاتی ہوئی اپنی آمدورفت کا حال بتانا شروع کر دیتی، میں کس راہ سے گئی، کتنی گاڑیوں کو پیچھے چھوڑ گئی اور کیا کیا آوازے مجھ پر کسے گئے۔ ایک رات اس نے دیر کر دی۔ مت پوچھو میرے دل پر کیا گزری۔ نو بجے فون کی گھنٹی بجی۔ لائن کے دوسری طرف سے بیوی کی اس قدر وحشت ناک آواز سنی کہ میں جل گیا: ''پیارے ڈرومت، کوئی مرا نہیں لیکن ایکسیڈینٹ ہو گیا ہے۔''

''ایکسیڈینٹ''

''ہاں''

''کس کے ساتھ''

''ایک ٹریفک آفیسر کے ساتھ''

ٹریفک آفیسر؟ خدایا! میری آنکھوں کے سامنے دنیا تاریک ہو گئی۔ حادثہ بھی جا کر ساری دنیا میں سے ٹریفک آفیسر سے ہوا اور پھر بھی بچاؤ ہو جائے؟

نہیں اس سے نہیں، اس کی موٹر سائیکل سے۔ گھر میں جتنی رقم ہے لے آؤ، ڈرائیونگ لائسنس بھی، ڈرائیونگ لائسنس سلائی مشین کے خانے میں ہے، تھانے لے آؤ، تھانہ توپ خانہ، وہ تین ہزار تومان کی بات کرتا ہے۔

میں نے بدمعاشوں جیسا لباس پہنا، سرخ ٹائی لگائی، ویلوٹ کا کوٹ پہنا، سر پر ٹوپی، ترچھی کر کے پہنی اور تھانے جا دھمکا۔ میرے جسم کا درجہ حرارت 39° تھا لیکن میری بیوی کہتی ہے کہ سٹیج پر میرا ورود بہت اعلیٰ تھا۔ میں نے جاتے ہی کہا ''میری بیوی نے کیا کیا ہے، قتل عمد کیا ہے۔''

بیوی صوفے کے کونے پر بیٹھی تھی اور بہت ڈری سہی بدبخت نظر آ رہی تھی مجھے اس پر بڑا ترس آیا۔ مجھے دیکھتے ہی شیرنی بن گئی اور کھڑی ہو گئی کہنے لگی ''میرا کوئی قصور نہیں ہے۔ سپاہی نے بھی اپنی رپورٹ میں یہی لکھا ہے۔ ماں کو پہنچا کر جیسے ہی واپس روانہ ہوئی تو وزارت صحت عامہ کے سامنے رکنا پڑا۔ راستہ بند تھا کیونکہ خباب برژنیف اپنے سراہوں کے ساتھ 'انجمن شیر و خورشید سرخ'' گئے تھے اور یہ وارنٹ آفیسر (میں نے اس کے کندھوں کے پھول دیکھے تو وہ کپتان تھے) برژنیف صاحب کی سکواڈ میں تھے، انہیں اس کے پیچھے جانا چاہیے تھا لیکن کس لئے انہوں نے اپنی بدوضع موٹر سائیکل سڑک کے عین درمیان پارک کی ہوئی تھی؟ جب ٹریفک چل پڑی تو سامنے میونسپلٹی کے ٹرک نے میرے آگے موڑ کاٹا تو مجبوراً میں ذرا بائیں طرف ہوئی اور صاحب کی موٹر سائیکل سے جا ٹکرائی۔ تمہیں کیا معلوم مجھ پر کیا بلا نازل

ہوئی، تقریباً میرے ٹکڑے ٹکڑے کر دیتے۔ خوشامدی آئے تھے برژنیف سے ہاتھ ملانے اور نعرے لگانے کے لئے۔۔۔۔ کہنے لگے بانو دلکش۔۔۔۔ اب بانو دلکش ان کی باتوں کا محور تھی، ''انہوں نے اس قدر بری بری باتیں کیں'' اور رونا شروع کر دیا۔

کپتان صاحب نے کہا ''سڑکوں کے اصل مالک ہم ہیں۔ جہاں ہمارا دل چاہے گاڑی کھڑی کریں، خانم بلا ڈرائیونگ لائسنس گاڑی چلا رہی تھی۔۔۔۔ اس کا جرم۔۔۔۔''

میں نے کپتان صاحب کی بات قطع کی، جیب سے بیگم صاحبہ کا ڈرائیونگ لائسنس نکالا اور کپتان صاحب کی آنکھوں کے سامنے لے گیا۔ انہوں نے جھپٹ کر لائسنس چھین لیا اور میں اس سے گتھم گتھا ہونے سے گھبرا گیا۔ اصل میں مَیں ٹریفک والوں اور افسروں سے ڈرتا ہوں۔ یہ میرے بس کی بات نہیں۔ بیوی کہنے لگی ''شاباش بے غیرت، میں نے لائسنس کتنی مصیبتوں کے بعد حاصل کیا تھا اور تم نے چھنوا لیا'' اور پھر رونا شروع کر دیا۔

ایک اور آفیسر ہمارے پاس آیا جس کے ہاتھ میں سپاہی کی حادثہ کی رپورٹ تھی، اس نے کہا ''آغا صلح کر لو! جو کچھ ٹوٹ پھوٹ گیا ہے وہ تم خرید کر کپتان صاحب کو دو اور کپتان صاحب لائسنس لوٹا دیں گے۔''

ہم مان گئے۔ بیوی نے سٹیرنگ سنبھالا۔ اس کے ہاتھ کانپ رہے تھے۔ میں اس کے پہلو میں بیٹھا جبکہ کپتان صاحب پچھلی سیٹ پر۔ ہم نے 'شاہراہ برق'' کی تمام Spare Parts کی دکانیں چھان ماریں لیکن مطلوبہ کمپنیوں کا سامان نہ مل سکا۔ میری بیوی تمام راستہ کپتان صاحب کو نصیحتیں کرتی رہی کہ تم اس ظاہری سجاوٹ کے پیچھے کیوں ہو؟ وہ کہتی تھی کہ اصل چیز تو آدمی کے سر میں ہے یعنی عقل اور شعور، ان جزئیات اور فروعی چیزوں کا کیا فائدہ؟ حتیٰ کہ اس نے یہ بھی کہا کہ قوموں کی پسماندگی کی وجہ یہ ہے کہ افسر ظاہری شان و شوکت کے لئے ہر وقت پیٹیاں کسے چمکتے دمکتے نظر آتے ہیں اور پھر عورتیں بھی مجبوراً ان کی پیروی کرتی ہیں۔ اسی لئے تو ہمارے ملک میں ٹیکسیاں، بیوٹی پارلر، مشروب کے سٹال وغیرہ کتابوں کی دکانوں سے زیادہ ہیں۔۔۔'' یہ پوری بات اچھی تھی لیکن یہ باتیں میری بیوی کی باتیں نہ تھیں۔۔۔ یعنی میری بیوی۔۔۔

ورکشاپ کی عمارت ہم تلاش نہ کر سکے۔ دوسری صبح تک تلاش ملتوی کر دی گئی۔ صبح کو میرا بخار بھی اتر گیا۔ بیگم اور کپتان صاحب کے ساتھ میں نے شاہراہ امیر کبیر کی تمام دکانیں چھان ماریں لیکن ورکشاپ کا پتہ نہ چل سکا۔ کپتان صاحب نے کہا جب تک ورکشاپ نہیں ملتی وہ ڈرائیونگ لائسنس واپس نہیں کرے گا۔ میری بیوی نے قسم کھائی کہ وہ بریگیڈیر کے پاس شکایت کرے گی۔ کہنے لگی کہ سپاہی کی رپورٹ کے مطابق کپتان صاحب کو تو سکواڈ کے ساتھ برژنیف کے پیچھے جانا چاہیے تھا۔۔۔؟ جناب کپتان کا رنگ فق ہو گیا۔ اس نے ڈرائیونگ لائسنس واپس کر دیا۔ ہمارے دو سو تومان خرچ ہو چکے تھے۔ اگر اس نے یہ دھمکی پہلے دی ہوتی یا شروع ہی میں وہ بریگیڈیر صاحب کے پاس چلی گئی ہوتی تو یہ دو سو

تومان بھی بچ گئے ہوتے۔

ابھی تک میں صحت یاب نہیں ہوا تھا کہ مجھے بندر عباس میں ٹھیکہ مل گیا۔ بیگم کے غیر مفید اور مختصر خط آتے تھے۔ نہ گاڑی کا ذکر ہوتا تھا نہ گھر میں ''نئے فوجی انقلاب'' کی خبر۔ آہستہ آہستہ مجھے امید پیدا ہو چلی کہ میری بیوی کے سر سے گاڑی کا بھوت اتر چکا ہے اور اب ہماری زندگی سابقہ طریق پر چل پڑے گی۔ میں نے اسے عبارت آرائی پر مشتمل خطوط لکھے۔ اہواز کے تھانے والی رات کا تذکرہ کیا اور یہ کہ تم نے ایک ہی رات میں مجھے اپنا دیوانہ بنا لیا تھا اور اسی صبح ریلوے سٹیشن کے ساتھ والی شاہراہ پر پیدل چلتے ہوئے تم نے کہا تھا کہ مجھے نیلا رنگ پسند ہے اور ''درخت زیزفون کے سایہ میں'' کے عنوان والی کتاب پسند ہے اور یہ کہ شادی کے دن تم نے مولوی کو تین دفعہ پوچھنے کی زحمت ہی نہ دی بلکہ پہلی مرتبہ فوراً ہاں کہہ دی تھی۔ اس کم آنے والے خطوط کی وجہ میں نے تیسرے بچے کی امید سے لگائی بلکہ میں نے ایک قدم اور آگے بڑھا لیا اور گاڑی بیچنے کی بات لکھی کہ اس طرح ہم قسطیں جلد ادا کر سکیں گے۔ اچانک بیوی کی جانب سے خاموشی ہو گئی۔ میں نے جوابی تار بھیجی۔ جواب آیا ''زندہ سلامت ہوں- نادیا'' اور پھر خاموشی۔

میں نے چھٹی لی اور تہران آیا۔ ''ضراب خانے'' کے چوک پر ایک حادثہ شدہ گاڑی نمائش کے لئے رکھی گئی تھی۔ گاڑی ٹکڑے ٹکڑے ہو چکی تھی لیکن اس کے باوجود میں نے پہچان لیا کہ یہ میری بیوی کی ''پیجو'' ہے۔ لازماً بیگم اب تک مر چکی ہے، ہاں، جس کی گاڑی اس حالت کو پہنچی ہو لازماً اس کے جسم کا کوئی عضو بھی سلامت نہ ہوگا۔ میں نے ٹیکسی کے ڈرائیور سے پوچھا یہ کب سے یہاں کھڑی ہے؟ اس نے کہا ایک ماہ ہو گیا ہے۔ پھر پوچھا اس کے ڈرائیور کا کیا بنا؟ کہنے لگا مجھے علم نہیں۔ گھر پہنچنے تک میں گھل گھل کر آدھا ہو چکا تھا۔ دستک دی۔ بیوی نے دروازہ کھولا۔ اس نے مکمل سیاہ لباس پہنا ہوا تھا اور سر پر جالی دار سیاہ نقاب ڈالا ہوا تھا۔ پوچھا: ''کون مر گیا ہے؟ والدہ؟ بچے؟'' کہا ''ڈرو مت کوئی نہیں مرا''۔

میں نے پوچھا پھر کیوں ماتمی لباس پہنا ہوا ہے؟

سرسری طور پر بتایا ''میں نے سخت حادثہ کیا ہے۔ میں بغلی سڑک سے جب بڑی سڑک پر آئی تو ایک کرنل صاحب سے ٹکر ہوئی'' یہ اس کی اپنی ہی آواز تھی۔ نہ تو ریڈیو تہران کے اناونسروں والی اور نہ فلم ایکٹروں والی۔

میں نے کہا ''تو پھر اس صورت میں ماتمی لباس پہننا سمجھ نہیں آتا۔''

کہنے لگی ''ایک ماہ ہونے والا ہے کرنل صاحب ہسپتال میں پڑا ہے۔ بیچارہ سر سے پاؤں تک پٹیوں میں لپٹا پڑا ہے۔ ہر روز فوجی ہسپتال جاتی ہوں تاکہ صلح نامہ لوں۔ حال ہی میں اس کی ایک آنکھ سے پٹی اتاری گئی ہے۔ ابھی ہسپتال سے آ رہی ہوں۔ میں نے کرنل سے کہا ہے کہ میں بیوہ عورت ہوں اور میرا شوہر حال ہی میں فوت ہوا ہے یہی وجہ ہے کہ ماتمی لباس پہنا ہوا ہے اور سیاہ جالی دار نقاب اس لئے ڈالا ہوا ہے تاکہ اس کا دل پگھل جائے اور صلح نامہ دے دے ورنہ خدا جانتا ہے چند ہزار تومان نقصان ادا کرنا پڑے گا۔

کمرے میں گئے تو میں نے پوچھا ''بچے کہاں ہیں؟''

کہا ''وہ صدیقہ خانم کے گھر ہیں'' وہ سچ کہہ رہی تھی، گئی اور انہیں لے آئی۔

دوسری صبح بیوی نے پھر سیاہ ماتمی لباس پہنا، سیاہ جالی دار نقاب ڈالا اور بچوں کو بھی سیاہ لباس پہنایا۔ دونو جیتے جاگتے بچوں کو آگے لگایا اور فوجی ہسپتال کرنل صاحب کو دعا کرنے روانہ ہوئی۔ بچوں کو سکھایا کہ جیسے ہی کرنل کی نظر تم پر پڑے تم رونا شروع کر دینا اور منہ سے کوئی بات بالکل نہ نکالنا۔

میری چھٹی ختم ہو رہی تھی۔ بیوی مجھے پرسکون انداز میں بتاتی تھی کہ کرنل صحت یاب ہو رہا ہے۔ اس کی دونوں آنکھوں سے پٹی اتار لی گئی ہے اور خود چل کر باتھ روم تک گیا ہے۔ میری بیوی بہت خوش تھی۔

میری چھٹی کی آخری رات تھی۔ میں نے تیسرے بچے کے بارے میں بیوی سے بات کرنا چاہی تو وہ اُکھڑ گئی اور کہا ''سیدھے ہو کر بیٹھو تو میں جناب کی خدمت میں مسئلہ پیش کروں۔'' میرے ضبط کے بندھن ٹوٹ گئے واقعی مجھ میں ایک اور کار خریدنے کی ہمت نہیں تھی۔

اس نے کہا ''میری جان تم جانتے ہو کہ میں دائمی نکاح اور ازدواجی زندگی کے خلاف ہوں۔ شادی ایک بورژوائی رسم ہے۔'' یہ خیالات میری بیوی کے نہیں تھے۔ کرنل صاحب کے بھی نہیں ہو سکتے تھے، صدیقہ خانم کے قطعاً نہیں تھے۔ اس کے تھے جو فائدہ، قسط، پسماندہ اقوام، زرق برق افسر اور عورتوں کی خبر رکھتا تھا۔ میں نے آؤ دیکھا نہ تاؤ اور کہا ''تمہارا ارادہ مجھ سے طلاق لینے کا ہے؟''

طنزیہ مسکراہٹ سے کہا ''ہاں، تم سمجھ گئے ہو اور تم جانتے ہو کہ تمہیں مجھے طلاق دینی ہوگی۔ لہٰذا بے عزت نہ ہو اور یہ کار کسی'' میں نے اپنی بات جاری رکھی ''تم اس کی بیوی بننا چاہتی ہو جس نے بورژوائی باتیں کیں۔''

اس نے کہا ''نہیں وہ شادی شدہ ہے'' میں نے جلتے سڑتے ہوئے پوچھا ''اس سے تمہاری آشنائی بہت دیر سے ہے؟''

اس نے کہا ''نہیں۔ میں نے اسے صدیقہ خانم کے گھر میں چند مرتبہ دیکھا ہے۔''

میں نے پوچھا ''پھر طلاق لے کر تم کیا کرو گی؟ مجھے چھوڑو لیکن بچے بدبخت ہو جائیں گے۔''

اس نے کہا ''یہ میری ذمہ داری ہے۔''

ہمارا جھگڑا دستر خوان پر ہوا تھا۔ میں نے ڈنڈوں سے بیوی کی مناسب پٹائی کی اور دونوں بچے روتے رہے۔ اِس جھگڑے نے اِس قدر طول کھینچا کہ ٹھیکہ بھی میرے ہاتھ سے نکل گیا اور میں واپس تہران لوٹ آیا اور بیوی کو طلاق دے دی۔

ٹھیک چار ماہ دس دن بعد میری بیوی نے سفید لباس، جالی دار سفید نقاب پہن کر کرنل صاحب سے شادی کر لی۔ بچے والدہ کو مل گئے۔ مجھ بے وقوف کے حصے میں ''پیجو'' کار کی باقی ماندہ قسطیں ادا کرنا آئیں اور کرنل صاحب نے نقصان کا مطالبہ نہ کیا۔

☆☆☆

رانی آکاش ہاشمی

رحمت کا فرشتہ

اماں نے دونوں ہاتھ ڈال کر اُس کے بال اتنی زور سے کھینچے کہ اُس کی آنکھوں کے آگے ایک لمحے کو اندھیرا چھا گیا۔ دھکے کے باعث وہ زور سے دیوار سے لگی اور بس اتنی سی دیر ہوئی کہ وہ چُوک گئی۔ اماں کا جوتا بالائی ہونٹ اور ناک کی پھنی کے عین اوپر لگا۔ جوتے کا اُبھرا کیل پل بھر میں ہونٹ کو خون آلود کر کے ''روبڑا'' بنا گیا اور وہ بھربھری مٹی کی طرح پسپائی اختیار کر کے فوراً نیچے بیٹھ گئی۔

''حرام زادی۔۔۔یاروں کو کھلا کھلا کر پیٹ بھرتی ہے اور اپنی بہن چاہے گڑگڑائے___ لجائے۔ سارے برتن بیچ کر تجھے ڈگری دلوائی تھی___ کتیا___ خصم پیٹی___ رانڈ___ '' وہ بڑبڑاتی رہیں۔

اور وہ چپکے سے کمرے میں پڑی کبھی اِس کبھی اُس زاویے سے خون آلود روبڑے کو دیکھتی رہی۔ اُسے تاسف ہو رہا تھا کہ ہمیشہ وہ چُوک جاتی تھی اور اماں کی مارکٹائی کوئی نہ کوئی داغ اُس کے چہرے یا جسم پر ضرور چھوڑ جاتی تھی۔ اب کے وہ بچ نہ سکی جس میں سراسر اس کی ''چستی'' کا قصور تھا۔ کل اُسے ہر حال میں حبیب سے ملنا تھا، مگر اب یہ ''روبڑا''۔

ایک ہفتے بعد حبیب سے ملی تو اُس کا منہ پھولا ہوا تھا۔ اب وہ اُسے کیا بتاتی کہ کس دل سے وہ جبر کیے رہی۔ حبیب کو منانے کے لیے اُسے آدھی تنخواہ کی قربانی دینی پڑی جو کہ اس دفعہ کے راشن کے لیے تھے۔ حبیب نے پانچ سو اُس سے اُدھار لیا، تین پیالے سُوپ پیا، کھانا کھایا، پیپسی پی اور پھر آئس کریم پر بضد ہو گیا۔ چالیس روپے جو بچے تھے وہ ٹوٹی فروٹی کی فرمائش پر خرچ ہو گئے۔ اُس کے ''روبڑے'' کا مدھم ہوتا اُبھار اشیائے خوردونوش کے انبار میں اُسے بالکل نظر نہ آیا۔ یہ بھی شکر ہوا ورنہ اماں نے تو کوئی کسر نہ چھوڑی تھی۔

اماں کو وہ کبھی نہ سمجھ سکی۔ اماں کو شادی سے نفرت تھی۔ اس سے پہلے ''اپیا'' نے لڑ جھگڑ کر زبردستی اپنا بَر تلاش کر ہی لیا اور بغیر اماں کو بتائے صندوقچی سے زیور کا ڈبا اُٹھا کر اُس میں پرچی پر لکھ کر ''میں اپنا حصہ لے کر جا رہی ہوں'' چلی گئی۔ پھر کبھی نہ آئی۔ آج نو سال ہونے کو آئے تھے پتا نہیں اپیا کا کیا بنا۔ نہ کوئی خط، نہ کوئی پتا۔ کبھی وہ خواب دیکھتی اپیا کی لاش کھالے میں پڑی ہے۔ کبھی دیکھتی اپیا بچوں کی اُنگلی پکڑے آ رہی ہے۔

اماں کہتی تھی ''موئے نے منہ کالا کر کے بیچ جنگل چھوڑ دیا ہوگا۔ کسی نائکہ کے پاس ہو گی۔ آئے تو سہی، گلی کے کتوں سے کٹواؤں گی۔'' گلی کے کتوں کے کاٹے جانے کے تصور ہی سے وہ لرزاں ہو جاتی۔ گلی کے کچھ کتوں کا قد تو اتنا زیادہ تھا کہ وہ چلتے ہوئے ان کے بیچ اپنے آپ کو چھوٹا سا پرندہ سمجھتی۔ ان کتوں کے جبڑوں کے دانت اس قدر بڑے ہوتے کہ وہ ان کو دیکھ کر آنکھیں بند کر کے گزرنے کی کوشش کرتی۔ کتوں سے خوف کے باوجود لاشعوری طور پر اس کے اندر ایک کتا پالنے کی خواہش تھی مگر

جب کبھی یہ خواہش اُبھرتی تو وہ سوچتی کہ وہ بڑا کتا ہرگز نہ لے گی۔ کیا خبر روٹی ڈالنے کے لیے وہ جائے اور انتہائی مانوسیت کے باوجود وہ اِسے کاٹ لے۔ کسی بھی چیز کے چہرے پر کاٹ جانے کے تصور سے وہ خوفزدہ رہتی۔ اس لیے وہ چھوٹا پلّا لینے کے حق میں تھی۔ پلنے کے بعد وہ اُسے اپنا عادی کرے گی۔ اپنے چہرے سے شناسائی دلوائے گی، پھر اس کے دراز قد کو وہ زنجیر کی گرفت میں ہاتھ میں تھام کر چلے گی تو کیسے لوگ خوف سے اِدھر اُدھر بھاگ جائیں گے۔ اس کی خواہش تھی کہ وہ ویگن میں سوار ہو تو اُس کا کتا اُچک کر آگے بڑھے اور سیٹ اُسے خود بخود مل جائے۔ خود بخود سیٹ ملنے کا تصور کتنا خوش کُن تھا۔

مگر ان خوش کُن تصورات کے سبب کے اماں سختی سے خلاف تھیں۔ ایک تو کتا جراثیم کا باعث بنتا، گندگی پھیلاتا، دوسرا اس کا خرچہ اور تیسرا اس کی موجودگی کے باعث رحمت کے فرشتے کا نہ آنا، جس کو اس گھر میں بقول اماں کے چکر لگائے ایک عرصہ گزر چکا تھا۔ اُن کے نزدیک وہ پہلی بار تب آیا تھا جب انہوں نے اس کے باپ کے گھر قدم رکھا تھا گویا فرشتے کی ذمہ داری اماں کو گھر میں لا کر چھوڑنے ہی کی تھی؟ رحمت کا فرشتہ تب سے اب تک کیوں نہ آیا؟ سُنا تھا رحمت کے فرشتے کے آتے ہی حالات سنور جاتے ہیں، موسم بدل جاتے ہیں، سمندروں کی طغیانیاں تھم جاتی ہیں، اُبلتے لاووں پر گلیشیئر کی سی ٹھنڈک اُتر آتی ہے۔

ایک عرصہ اُس نے رحمت کے فرشتے کا انتظار کیا، مگر اُسے نہ آنا تھا، نہ آیا۔ دل کے موسم ٹھہرے رہے، ٹھہرے رہے، حتیٰ کہ کائی جم گئی۔ کائی جمی فصلوں پر خوف کے باوجود وہ کتے کی زنجیر پکڑ کر سیر کرتی۔ ایسے میں اس کے ذہن میں یہ خیال بھی آتا کہ اگر رحمت کا فرشتہ آیا تو وہ کتے کی اجازت اُس سے لے لے گی۔ مگر کیا اماں مانے گی؟ اُس کی ہوش میں آج تک اماں کبھی بھی کسی بھی چیز کے لیے نہ مانی تھی۔ کسی چیز کی افادیت کو تسلیم کرنے کے باوجود بھی وہ مکمل رضامندی کا اظہار کبھی بھی نہ کرتی۔ ابا کام سے واپس آتے تو اماں محلّے بھر کی لڑائیوں کا حال سُنانے بیٹھ جاتی۔ ساتھ ساتھ اپنے پرانے کنوارپنے کے دن یاد کر کے رونے لگتی۔ پھر پٹی سر پر باندھ کر ہاتھ کمر پر رکھ کر جھاڑو لے کر کچے صحن میں زور زور سے پھیرنے لگتی۔ گرد اُڑ اُڑ کر ابا پر پڑتی رہتی مگر وہ وہیں بیٹھے رہتے۔ پانی کا گلاس پی کر وہ ٹوٹی ادوائنیں کسنے لگتے جو رات رات ہی میں ڈھیلی ہو جاتی تھیں۔ اماں دھونے والے برتن اکٹھے کر کے دھونے بیٹھ جاتی۔ رات آٹھ بجے کے بعد چولہا جلتا اور دس بجے تک ڈوئی ہنڈیا میں کھڑکتی رہتی۔ جب وہ سونے کے لیے بستر کی طرف بڑھتے تو محلّے کے لوگ آدھی نیند پوری کر چکے ہوتے تھے۔

صبح سویرے اماں کے چموٹوں کی آواز سے اُن تینوں بہنوں کی آنکھ کھلتی۔ ابا بھانے سے دُودھ لا کر رکھتے اور اماں کے جلال کو دیکھتے ہوئے چپکے سے سائیکل اُٹھا کر کام پر کھسک جاتے۔ ابا نے کبھی اماں سے اس بات پر اعتراض نہ کیا تھا کہ صبح کو اُٹھ کر دودھ تو بھانے سے میں لاؤں اور چائے تم لوگ پیو۔ اُس کی ہوش میں آج تک اماں نے صبح کے وقت خاص طور پر ابا کو چائے بنا کر نہ دی۔ سوائے روٹین کے کھانے کے جو سب کے لیے بنتا تھا۔

حبیب کو اُس کی زندگی میں لانے کا باعث اماں ہی تھی۔ حبیب عاتکہ کا بھائی تھا اور عاتکہ نے دو تین دفعہ کام کے سلسلے میں اُسے گھر بھیجا تھا۔ ایک دن جو اماں کو پیا پر غصہ آیا تو ساتھ ساتھ اُسے بھی رگید گئیں۔

''وہ چنڈال تو گئی یہ دوسری تیار ہوئی بیٹھی ہے۔ پردے اُٹھا اُٹھا کر یاروں کو خط پتر دیتی ہے۔ میں پوچھتی ہوں کیوں آیا تھا حبیب یہاں؟ کل بھی تو گلی میں کندھے سے کندھا ملائے اُس کے ساتھ چل رہی تھی۔''

حبیب راستے میں اچانک مل گیا۔ وہ پکی استانیوں کی طرح سے کاپیاں، فائلیں اور چیک کرنے والے پیپروں کے بوجھ تلے آ رہی تھی، اُس نے ازراہِ ہمدردی اُس سے چیزیں تھام لیں۔ یہی وہ لمحہ تھا جو اماں نے دیکھا اُس وقت تک اُس کے دل میں حبیب کے لیے کچھ بھی نہ تھا۔ پتا نہیں وہ کون سا جذبہ تھا جو اُسے حبیب کے قریب لے آیا۔ حبیب گھنٹوں اُس کی جھوٹی تعریفیں کرتا، اس کے قد وبُت کی تعریف میں زمین و آسمان کے قلابے ملاتا، اُس کی آواز کی نغمگی کی تعریف کرتا، حالانکہ اُسے پتہ تھا کہ اُس کی آواز مردانہ آوازوں کے زمرے میں آتی ہے، مگر اِس کے باوجود اس تعریف کے بعد کوئل کی آواز بھی اُسے اپنے سامنے ہیچ معلوم ہوتی۔

کیا اُسے حبیب سے محبت تھی؟

اُس نے کئی بار اپنے آپ کو ٹٹولا۔ ٹٹولنے کی خواہش میں اُس کے ناخنوں کے بعض حصے کچھ زیادہ ہی سختی سے اس کے جسم کے ماس سے جا ٹکرائے اور اُسے ''نورَس'' پڑ گیا۔ جس کی دوائی کے لیے علیحدہ سے خرچے کی فہرست بنانی پڑی۔ سو دوبارہ کبھی اُس نے اپنے آپ سے یہ سوال نہ کیا۔ شاید اگر اماں اُسے اس قدر زچ نہ کرتی تو وہ اُس کی زندگی میں نہ آتا۔ اُس کے زندگی میں آنے کے بعد وہ مالی طور پر خاصی حد تک دیوالیہ ہو گئی۔ حبیب کو آئے روز کچھ اُدھار کی ضرورت پڑتی رہتی تھی۔ اُس کا اُدھار مانگنے کا سٹائل کچھ ہٹ کر تھا۔ چیکے سے پہلے اُس کے پرس کی رقم گنتا پھر کہتا ''لاؤ بھئی میرا حصہ دو۔'' وہ چپکے سے اُسے تھما دیتی آج تک اُس نے کبھی حبیب کو انکار نہ کیا کیونکہ اُس کی ضرورت ہی اس نوعیت کی ہوتی تھی۔ حبیب پر فلم ڈائریکٹر بننے کا خبط سوار تھا۔ آہستہ آہستہ اُس نے تھوڑی سی اپنی جگہ بھی بنا لی تھی اور پھر ایک آدھ ڈرامے کے پیچھے اس کا نام بھی آ گیا تھا اور اُس دن سے اُس کے اُدھار کی رفتار میں بھی تیزی آ گئی تھی۔

''آنے والا وقت میرا ہے تم دیکھنا۔ بڑی بڑی ایکٹرسیں مجھ سے ملنے کی متمنی رہتی ہیں۔ آج پندرہ لاکھ کا پراجیکٹ تیار کیا ہے۔ یہ لسٹ دیکھو۔'' وہ ایک کمپوزڈ تحریر اُسے مخصوص مونوگرام کے ساتھ دکھاتا۔ ''چلو پندرہ روپے چائے کے دو۔ وہ اُس کا پرس اُٹھا کر زپ کھول کر اُسے تھما دیتا اور وہ پندرہ لاکھ کے پراجیکٹ کو تہہ کر کے پندرہ روپے چائے کا بل دے دیتی۔

حبیب جب سے شوبز میں گیا تھا مہنگے کھانوں کا چسکہ ساتھ لایا تھا۔ اُسے سوپ پینا پسند تھا مگر ازلی کفایت شعاری کے باعث وہ ہمیشہ ایک پیالہ سوپ دو چمچوں اور ایک خالی پیالے کے ساتھ منگواتا۔ وہ سوپ کا شوربہ پہلے خالی پیالے میں ڈالتا، پھر دو تین چھوٹی چھوٹی بوٹیاں گن کر اس کے پیالے میں ڈالتا۔

''مصالحہ تم اپنے حساب سے ڈال لو۔'' وہ یہ کہہ کر اپنے تین تہائی سوپ کو تیار کر کے اُس کے ایک تہائی سوپ کے لیے مصالحہ اُس کی طرف بڑھا دیتا۔

حبیب نے آج تک کھانے کے کسی بھی بل کی ادائیگی نہ کی تھی۔ وہ ریسٹورنٹ میں بیٹھ کر کارپٹ کے ڈیزائن کو ریجیکٹ کرتا اور کبھی صوفوں کی ترتیب کے درست نہ ہونے پر لمبی بحث کرتا۔ وہ ہر چیز میں فائدے اور صرف فائدے کا قائل تھا۔ خسارے کا اُس نے نہ کبھی سوچا تھا اور نہ اُسے کبھی ہوا تھا۔ وہ جنس کو بھی ایک فائدہ سمجھ کر بروئے کار لاتا تھا۔ جنس اُس کے نزدیک زندگی کا سب سے ضروری فعل تھا، جس کی بحث پر وہ دُنیا بھر سے نکات اُٹھا لاتا، مگر آج تک یہ فائدہ بھی اُس نے بغیر ٹکا خرچ کیے حاصل کیا تھا۔ اس فائدے کا سبب وہ اپنا تجربہ بتاتا۔ وہ پیچھے کچھ بھی چھوڑے جانے کے حق میں نہیں تھا۔

حبیب ہمیشہ اُسے خالی ہاتھ خالی جیب نظر آیا۔ اُس کا کمایا ہوا پیسہ کہاں جاتا تھا۔ حبیب ہر دم مصروف رہتا، اس کی جیبوں میں چھوٹے بڑے ڈراموں کے سکرپٹس کی فوٹو کاپیاں ہوتیں، مگر اس ساری مصروفیت کے عوض کمایا ہوا روپیہ اُسے کبھی حبیب کی جیب میں نظر نہ آیا یا شاید وہ گم جیبوں میں رکھتا ہو۔ حبیب سیانا بھی بہت تھا۔ جب اُس کی اُس کے ساتھ منگنی کی بات چلی تو ماں کے ذریعے بیس روپے ہتھیلی پر رکھوا دیئے۔ اُس نے منگنی کی انگوٹھی کے لیے کہا تو وہ بڑی بوڑھیوں کے انداز میں اُنگلیوں پر کچھ گننے لگا، پھر پوروں پر حساب لگانے لگا۔ ''بے وقوف یہ منگنی ونگنی سب بکواس ہے ہم ڈائریکٹ بیاہ کریں گے۔''

حبیب نے منگنی کے خوف سے اُسے عید پر ہی پیشگی ایک سلک کا سوٹ، سستی سی سیل کی جوتی اور کانچ کی چوڑیاں بھیج کر حساب بے باک کر دیا۔ ''پاگل ہم شادی سادگی سے کر کے وہ ہی بچا کر اپنا گھر بنائیں گے، تمہاری تنخواہ کی کمیٹی ڈال لیں گے اور میری سے گھر کا خرچ نکل آئے گا۔'' منگنی کے خوف سے نکل کر وہ شادی کے خرچ کے بارے میں فکرمند تھا۔ ''سنو بیڈروم میں رنگین ٹی وی ضرور ہونا چاہیے اور ہاں فرنیچر ذرا آج کل کے حساب سے بنوانا۔ ویسے تمہارے جہیز کی فہرست کیا ہے؟ اس میں تھوڑی سی ترمیم کرتے ہیں۔ پاگل وہی چیزیں کم کر کے تم پلاٹ لے سکتی ہو۔ آج کل زمین سستی مل رہی ہے۔ حبیب کو دو سے دو بخوبی بنانا آتے تھے۔

اماں کو حبیب کی شکل سے چِڑ تھی، صرف حبیب کی شکل ہی سے نہیں ہر اُس مرد کی شکل سے چِڑ تھی جو اُن بہنوں کو ازدواجی نظر سے دیکھتا۔ شگو کو درس دیتی ''یہ مرد ذات نچوڑ کر رکھ دے گی۔ سسرال کے جوتے پڑتے ہی سارا شباب بھک سے اُڑ جائے گا۔ کھاؤ پیو عیش کرو۔ میں تو یہ غلطی کیے بیٹھی ہوں تم نہ کرنا۔'' اماں کی ضد ہی میں اُس کی حبیب سے شادی ہو گئی۔

شادی کی رات حبیب نے اُسے جس کمرے میں لا بٹھایا اُس کی حالت بوسیدہ تھی۔ اُسے کمرے کے جالوں کی طرف دیکھتا پا کر وہ بولا ''ہم دونوں مل کر یہ جالے اُتار لیں گے۔ ویسے بھی ہم نے کون سا یہاں اس گھر میں مستقل رہنا ہے۔ اس لیے میں نے صفائی نہیں کروائی۔ ہم اپنا پلاٹ لیں گے اور

پھر۔۔۔ٹھہرو! میں تمہیں تحفہ تو دوں'' اُس نے جیب سے ایک سستا سا پرفیوم نکال کر اُس کی طرف بڑھایا۔''اسے سونگھو۔'' وہ پرفیوم کی شیشی کو اُس کی ناک کے قریب لایا۔ جذبات کے بھڑکنے کے لیے وہ پرفیوم کی خوشبو کو وسیلہ بنانے پر تُلا ہوا تھا۔''تمہارا جسم بہت گدرا سا ہے، روئی کی طرح، یہاں سے تو ٹھیک ہے، یہاں سے بھی ٹھیک ہے، یہاں سے___'' اُس کے ہاتھ چھاتیوں کے اُبھار پر تھوڑی دیر کو رُکے اور پسلیوں کو چھوتے، کمر سے ہوتے کولہوں پر آ گئے۔''یہاں سے___اونہوں___یہاں سے موٹا ہے۔ اس کا علاج کرنا پڑے گا۔ تمہیں پتا ہے ناں مجھے سمارٹ لڑکیاں پسند ہیں۔ تمہارا رات کا کھانا بند۔ آج سے ابھی سے۔'' ایک گھنٹہ مسلسل اس کی پیمائش کرنے کے بعد وہ اُٹھا اور باہر چلا گیا۔ پندرہ بیس منٹ بعد لوٹا تو ہاتھوں میں ٹرے تھی۔ ٹرے بیڈ پر رکھ کر وہ کھانا کھانے لگا۔''تم نے نہیں کھانا، نصیحت یاد ہے ناں'' وہ پیار سے اس کی گال پر چٹکی کاٹ کر بولا مگر حلق میں نوالہ لگنے کے باعث مڑا اور میز پر پڑا جگ منہ سے لگا لیا۔ اُس نے نہ جانے کس جذبے کے تحت ٹرے کا کپڑا اہٹایا۔ روٹی ایک ہی تھی جس کا آدھا حصہ حبیب کھا چکا تھا اور بقیہ روٹی پڑی تھی۔ سویٹ ڈش کی ایک چھوٹی سی رکابی تھی اور ایک ہی چمچ تھا۔ گلے کا گلوبند اُتار کر اُس نے سرہانے رکھا اور آنکھیں موندلیں۔

اگلے دن شام کو حبیب آیا تو صحن میں ایک دراز قد بڑے جبڑوں والا کتا اور ایک چھوٹا سا پلاّ صحن میں رکھے برتنوں میں بالترتیب گوشت کھاتے اور دودھ پیتے نظر آئے۔ وہ صحن میں ٹوٹے ہوئے سائیکل کے پاس ہی کھڑی تھی۔ انہیں تم لائی ہو۔ وہ پوچھنے ہی لگا تھا کہ نظر اُس کی گردن پر گئی۔

''گُلو بند کہاں ہے؟''

''بیچ دیا۔''

''کیوں؟''

''ان کی قیمت جو چکانا تھی۔ پھر ایک ہفتے کی خوراک کا بندوبست بھی کرنا تھا۔'' وہ دونوں ٹائروں کی درمیانی جگہ میں اٹکی زنجیر کو گول چکروں میں ڈالنے کی کوشش میں لگی رہی۔

''میں نے بتایا بھی تھا کہ زمین سستے داموں بک رہی ہے۔'' صدمے سے حبیب کی آواز بہت کم ہوگئی تھی۔

''ہاں مجھے پتا ہے زمین سستے داموں بک رہی ہے۔'' اُس نے کہا اور بیگ میں سے تازہ کچا گوشت نکال کر دراز قد کتے کے برتن میں ڈال دیا۔ چھوٹا پلاّ مزید دودھ کے لیے اُس کی طرف دیکھ رہا تھا۔ اُس نے گلاس بھر کر دودھ اُس کے مٹی کے پیالے میں انڈیلا اور خود اَدھ کھلی چٹیا کو بل دیتی اندر کمرے کی جانب چل دی۔ حبیب ہونقوں کی طرح سے آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر اُس کی پشت کو گھورتا رہا۔

☆☆☆

اوریانا فلاشی/ خالد سعید قسط ۵

ایک مرد

تم نے چیتے کی مانند انتہائی پھرتی سے چارپائی سے چھلانگ لگائی اور چیتے کے ایک پنجے کی سی طاقت سے تم نے اُس کے ہاتھ کو اپنی گرفت میں لیا اور دوسرے پنجے سے اُس کے سر کو پیچھے کی جانب دھکیلا اور شیر کی مانند دھاڑے: تھیوفلونیاکوس(Theophiloiannakos) ''گانڈو، تم ایسے سارے ہی میجر وردی پوش ہوتے ہیں!'' اور فوراً وہ سب کچھ ہو گیا جسے تم ہوتا ہوا دیکھنا چاہتے تھے اور جسے واقعی ہونا چاہیے تھا۔ مالیوس(Malios) اور بابالیس(Babalis) کے ضبط کے بندھن ٹوٹ گئے ایسے جیسے وہ سپرنگ یک بیک کھل گیا ہو، جس نے انہیں اس لمحے تک باندھ رکھا تھا، تینوں لٹھ بردار سرجنٹ حالت سکون سے باہر آ کر تم پر چڑھ دوڑے اور تھیوفلونیاکوس کو تمہاری آہنی گرفت سے رہائی دلائی۔ تمہارا یہ اچانک حملہ، تم سے زیادہ طاقتور اور تازہ دم چھ افراد کے خلاف اعلانِ جنگ بن گیا۔ دو فوجیوں نے سامنے سے حملہ کیا، دو پیچھے سے لپکے اور دو نے بالترتیب دائیں اور بائیں سمت سے تم پر حملہ کیا۔ ضربوں کی بوچھاڑ میں، بندوق کے کندوں سے مار؛ گھونسے اور اس سب میں تم پھسلے، گرے، پھر سنبھلے، دوبارہ پھسلے، پھر اُٹھے اور یوں اُن شدید ٹھوکروں کا مقابلہ کرتے رہے۔ اُن کی جانب سے لگائی گئی چوٹوں اور ضربوں کو اپنی کہنیوں اور سر پر روکتے رہے۔ ایک تندخو اور غضب ناک چیتے کی مانند جو شکاری کے جال میں پھنس گیا ہو، لیکن جو اس جال کو ہر حال میں تار تار کرنے پر تُلا ہو۔ قریب رکھی ایک بڑی میز اُلٹ گئی اور اِس دھکم پیل میں ایک کُرسی فضا میں اُڑتے ہوئے بابالیس(Babalis) کے جسم کو رگڑتے ہوئے گزر گئی۔ وہ ایک عالمِ دہشت و ہراس میں مزید فوجی کمک کے لیے دروازے کی جانب دوڑا حالانکہ تھیوفلونیاکوس نے سخت احتجاج کیا کیونکہ وہ یہ تو ہرگز نہیں چاہتا تھا کہ اِس حد درجہ شرمسار کرنے والے منظر کے مزید گواہ بھی ہوں۔

''کمک میری گانڈ'' لیکن اس سے پہلے ایک اور فوجی افسر بندوق ہاتھ میں تانے اندر گھس آیا اور تم نے غیر متوقع طور پر اُس جال کو توڑ دیا: تم بندوق پر قبضہ کرنے کے لیے اُس کی جانب لپکے اور اگرچہ بندوق فوجی کی آہنی انگلیوں کی گرفت میں تھی مگر تم اُس پر جھپٹے اور بندوق کو اُس سے چھین لیا۔ ایک شدید عالم طیش میں تمہیں اپنے سر، کاندھوں اور بازوؤں پر لاٹھیوں اور گھونسوں کی ضربیں قطعاً نہ محسوس ہوئیں البتہ اُن کی چیخ و پکار، واویلا اور کبھی کبھار ضربوں کی مدہم صدا تم تک پہنچ رہی تھی۔ اس ہنگامے اور شوروغل میں ایک لاٹھی مالیوس کے ماتھے سے ٹکرائی۔ مالیوس شدید درد سے ڈکرایا اور حالت غضب میں اس ضرب کے ذمہ دار کو ایک زوردار ٹھڈا رسید کیا۔ بابالیس نے شدید غصے میں مالیوس کو پکڑ کر اُس کے منہ پر زناٹے دار تھپڑ جڑ دیا۔ اب یہ لڑائی اُن دونوں کے درمیان شروع ہوگئی۔ پھر یہ فساد پھیلتا چلا گیا اور وہاں موجود

دوسرے لوگوں کو بھی اپنی لپیٹ میں لے لیا۔ وہ سوچے سمجھے بغیر اور کوئی واضح نشانہ لیے بغیر، بے ڈھنگے پن سے ایک دوسرے پر حملہ آور ہوتے رہے اور اس سارے عرصہ میں ایک دوسرے سے پُرسکون رہنے کی درخواستیں بھی کرتے رہے۔ ''بند کرو، بند کرو، روکو! روکو! کیا کر رہے ہو۔ دکھائی نہیں دے رہا کہ یہی کچھ تو وہ چاہتا ہے۔ آپس میں لڑنے کی بجائے اُسے فوجی افسر کے حوالے کرو۔ وہی اس کی صحیح خبر لے گا۔'' تم بدستور اُن کے ساتھ دھکم پیل کرتے رہے اور انہیں زوردار جھٹکے دیتے رہے۔ اب تمہیں محسوس ہو رہا تھا کہ لحظہ بہ لحظہ بندوق پر فوجی افسر کی انگلیوں کی گرفت ڈھیلی پڑ رہی ہے۔ تم اُس سے بندوق چھیننے والے ہی تھے: ایک زوردار جھٹکا، اور بندوق اب تمہارے ہاتھ میں تھی۔ تم نے ایک نشانہ لیا اور یکایک جیسے تمہارے سر پر آسمان اپنے تمام تر وزن سمیت آن گرا ہو۔ اتھاہ تاریکی۔ ہولناک اندھیرا۔ ہزاروں شکاری پنجوں نے تمہیں اپنی آہنی گرفت میں لے لیا۔ ایک ہزار بندی خانے۔

بدقسمتی سے تم ابھی تک بے ہوش نہ ہوئے تھے۔ سر پر پڑنے والی ان ضربوں سے تمہیں ایک شدید چکر آیا۔ تم نے اپنی پلکیں اُٹھائیں، اپنے اردگرد دیکھا اور یہ جاننے کی کوشش کی کہ تم اب کس زماں و مکاں میں ہو اور تمہیں کس شے نے یوں مفلوج کر دیا تھا۔ تمہیں پھر اُس ٹوٹے ہوئے سپرنگوں والی آہنی چارپائی پر ڈال دیا گیا تھا۔ اس بار انہوں نے پوری سختی سے تمہیں گھٹنوں اور کلائیوں سے باندھ دیا تھا۔ ایک فوجی تمہاری چھاتی پر اور دوسرا تمہاری ٹانگوں پر چڑھ بیٹھا تھا۔ تھیوفلونیاکوس (Theophiloiannakos) نے تم پر جھک کر ہانپتے ہوئے کہا ''حرامی الدہر، ہم تمہارا قیمہ بنا دیں گے! بالکل قیمہ!'' تم نے اُس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر دیکھا اور سوچا ''اگر میں اس کے مکروہ اور منحوس چہرے پر تھوک سکوں'' تمہاری زبان نے قریب قریب خشک منہ سے باقی ماندہ رطوبت کے چند قطرے جمع کیے اور انہیں تمہارے ہونٹوں تک لے آئی۔ ''ڈنڈا لاؤ'' بابا لیس ڈنڈا لیے آگے بڑھا ''اب تمہیں پتہ چلے گا، غدار، ملک دشمن، ننگ وطن!'' ڈنڈا پوری شدت کے ساتھ تمہارے پیروں کے تلووں سے ٹکرایا۔ ایک بار، دوبارہ، پھر درجنوں بار۔ تشدد کا یہ طریقہ فلانجی (Falange) کہلاتا ہے۔ بے حد تکلیف دہ، ناقابل برداشت حد تک تکلیف دہ اور یہ محض درد ہی نہیں تھا۔ ایک ایسا شدید برقی جھٹکا جو پیروں کے تلووں سے دماغ تک سفر کرتا تھا۔ دماغ سے وہ کانوں میں اترتا تھا۔ کانوں سے معدہ، معدہ سے انتڑیوں اور انتڑیوں سے گھٹنوں میں پہنچتا تھا۔ جہاں پر تمام تر تشنج، اینٹھن اور درد مرکوز ہوتا تھا۔ ایک آواز ایک ہی ترتیب سے مسلسل ظاہر ہو رہی تھی ''اب یہ لو، اور یہ، اور یہ، اور یہ، اور یہ'' اور تمہارا ذہن خود سے منت سماجت کرتا تھا۔ اب مجھے ہوش کھونے دو۔ یسوع، میرے ہوش لے لو۔ میں رونا اور چلانا نہیں چاہتا۔ اس لیے بہتر ہے کہ بے ہوش ہو جاؤں لیکن تم چلائے بغیر کیسے رہ سکتے تھے؟ تم چلائے اور پھر تمہارے خیالوں سے ماورا بدترین وقوع پذیر ہوا۔ تھیوفلونیاکوس نے تمہارا منہ بند کر دیا تاکہ تم چلا نہ سکو۔ اُس نے اپنے انگوٹھے اور انگشت شہادت سے تمہارے ناک کو دبایا اور اپنی ہتھیلی کو تمہارے منہ پر رکھ دیا۔ اب تم سانس نہ

لے سکتے تھے۔ نہیں، نہیں، میرا گلا مت گھونٹو۔ یہ برداشت کرنا میرے بس سے باہر ہے۔ دنیا میں موجود ہر چھوٹے بڑے ہتھیار کو مجھ پر آزماؤ، مجھے چھلنی چھلنی کر دو مگر خدارا مجھ سے میری ہوا مت چھینو__ یسوع__ ایک تھوڑی سی ہوا، محض تھوڑی سی ہوا۔ مدد اے یسوع__ کاش میں اُسے دانت سے کاٹ سکتا۔ اگر میں کسی طرح اپنے دانت منہ سے باہر کر کے اُس کی انگلی کاٹ سکوں، وہ محض ایک لمحے کے لیے اپنا ہاتھ تمہارے منہ سے ہٹاتا اور بس وہی پل محض ایک پل تمہارے لیے سوچ اور سانس کا وسیلہ تھا۔ تم نے اپنی باقی ماندہ توانائیوں کو مجتمع کیا۔ دھیان کا ایک پل اور تمہاری کل شکتی تمہارے جبڑوں میں مرکوز ہو گئی۔ دھیرے دھیرے، بے حد آہستگی سے تم نے اپنی پوری طاقت سے اپنے جبڑے کھولے اور اُس کے دائیں ہاتھ کی چھوٹی انگلی کو دانتوں میں بھینچ کر ٹکڑے ٹکڑے کر دیا۔ ایک وحشی بلبلاہٹ اور اب یہ تھیوفلونیاکوس تھا جو اپنے خون میں غلطاں ہاتھ کو تھامے ہوئے تکلیف اور درد سے چلا رہا تھا۔ اُس کی چھوٹی انگلی قریب قریب دو ٹکڑے ہو گئی تھی اور پھر وحشت و بربریت اُن کے سروں پر سوار ہوئی۔ ''غدار، وطن دشمن، طوائف کا جنا، طوائف کا جنا، جاسوس، حرامی، غدار!'' وہ سب ہم آواز ہو کر چلائے، وردی پوشوں کا کورس اور اُن میں سے ہر ایک نے تمہیں زوردار تھپڑ رسید کیے۔ ایک نے پوری قوت سے آہنی پلنگ کے جنگلے سے تمہارا سر ٹکرایا، ایک اور نے تمہارے وجود کے ہر ہر حصے پر ایسی ضربیں لگائیں کہ تمہارے جسم کا کوئی حصہ بھی کسی طرح کے ردِعمل کے قابل نہ رہا۔ ٹوٹے ہوئے نوکیلے آہنی سپرنگ تمہارے ماس میں بہت اندر تک گھس گئے۔ درد و تکلیف، مفلوج کر دینے والی بے حسی میں تبدیل ہو رہی تھی۔ بے ہوشی، خداوند یسوع مجھے بے ہوش کر کے کچھ لحظوں کے لیے آرام دے۔ مجھے کچھ دیر کے لیے موت دے دے۔ بالآخر ہر سو تاریکی چھا گئی۔ ایک طول طویل اندھیرا، جس میں تم یوں اُترے جیسے کوئی ہمیشہ کے لیے آزاد کر دینے والے پاتال میں اُترتا ہے اور گہرا سکوت۔ ایک ایسی خاموشی جو تمہارے کانوں میں بھِڑوں کی بھنبھناہٹ کی مانند گونجتی ہے۔ تمہارا منہ خون سے لتھڑا ہے۔ کنپٹیاں پھٹ چکی ہیں اور تمہارا شعور مدت سے منتظر اُس راحت کی چاہت میں معدوم ہوا۔ موت کچھ دیر کیلئے تمہارے جی میں جی رہی تھی۔

جب تم نے دوبارہ اپنی آنکھیں کھولیں تو نہ صرف یہ کہ تمہاری کلائیاں اور گھٹنے بندھے ہوئے تھے بلکہ تمہارے پیٹ کے اوپر سے ایک رسی کو یوں کس کر باندھا گیا تھا کہ تمہارے بازوؤں، ٹانگوں اور سر میں کوئی حس باقی نہ رہی تھی۔ تم صرف اپنے چہرے کو محسوس کر سکتے تھے اور باقی کچھ نہ رہا تھا۔ جیسے تمہاری گردن اُڑا دی گئی ہو اور تمہارا بریدہ سر اپنے طور پر جی رہا ہو۔ تم نے اپنے ہونٹوں پر زبان پھیری اور وہ تمہیں غیر معمولی طور پر بڑے محسوس ہوئے اور تم نے سوچا کہ وہ خوفناک حد تک سوجے ہوئے تھے۔ تم نے اپنے پپوٹے اُٹھانے کی کوشش کی اور تمہیں یوں لگا جیسے اُنہیں کسی گاڑھی سریش سے چپکا دیا گیا ہو اور تم نے سوچا کہ تمہاری آنکھیں بھی خوفناک حد تک سوج چکی ہوں گی۔ تمہاری چپچپاتی پلکوں سے پرے چند مبہم اشکال ہانپ رہی تھیں۔ ایک نے ہنستے ہوئے کہا ''کیوں کیسا کام دکھایا ہے!'' ایک سایہ سا معمول کے

انداز میں سانس لیتے ہوئے آگے بڑھا اور تھیوفلونیاکوس نے اُس سے کہا ''وہ ادھر ہے۔کیا یہ وہی شخص ہے؟'' سایہ تمہارے قریب ہو کر تم پر جھکا اور تمہیں یوں لگا جیسے تمہیں کسی گہرے بادل نے ڈھانپ لیا ہو، ایک جھجکتی اور ہچکچاتی ہوئی آواز نے تم سے پوچھا ''کیا تم نے مجھے پہچان لیا ہے؟'' تم نے بے حد مدہم آواز میں اُس کی شناخت سے انکار کیا، تھیوفلونیاکوس نے فوری مداخلت کی ''کاذب، بدکار، ملک دشمن، تم نے اس افسر کے ہمراہ تربیت حاصل کی اور اب تم اُس کی شناخت سے انکاری ہو؟'' سایہ ایک بار پھر تم پر جھکا۔ممکن ہے اُس نے اس بات کو محسوس کر لیا ہو کہ تم جارج نہیں تھے لیکن بعض وجوہ کی بنا پر وہ یہ بات نہیں کہنا چاہ رہا تھا۔ ''خیر!'' تھیوفلونیاکوس نے پھر اصرار کیا۔سایہ تم پر اپنے پسینے کی بوندیں گراتے ہوئے خاموش رہا۔ ''مجھے بتاؤ، صاف لفظوں میں بتاؤ یہ وہی ہے کہ نہیں؟'' ''میں پورے یقین سے نہیں کہہ سکتا۔ ممکن ہے یہ وہی ہو لیکن مجھے لگتا ہے کہ وہ کچھ بدلا بدلا سا لگ رہا ہے۔شاید تم نے اس کے ساتھ جو کچھ کیا ہے اُس کی بنا پر مجھے اسے پہچاننے میں دقت پیش آ رہی ہے۔'' ''ٹھیک ہے تم کل پھر آ جانا۔'' دوسرے دن وہ پھر آیا، پھر اگلے روز، پھر اُس سے اگلے روز، لیکن ہر روز وہ یہی ایک جواب دیتا۔ کیونکہ ہر گزرتے ہوئے دن کے ساتھ تم اُس کے لیے زیادہ سے زیادہ ناقابل شناخت ہوتے جا رہے تھے۔ ہر روز آفیسر، سرجنٹ اور فوجی تم پر بے پناہ تشدد کرتے: شاید، عوام کے مفاد میں۔ وہ عوام جن کے لیے ہم دکھ بھوگتے ہیں، آنسو بہاتے ہیں، ہر طرح کی ایذائیں سہتے ہیں، جدوجہد کرتے ہیں اور اُن کے ہر جرم کا جواز دیتے ہوئے انہیں سادگی اور معصومیت کی بنا پر بری الذمہ قرار دیتے ہیں۔ پانچ برس بعد جب میں تمہاری سانس کی تکلیف کے سلسلے میں تمہیں ڈاکٹر کے پاس لے گئی اُس نے تمہارے ایکسرے کے لیے کہا۔ جب ریڈیالوجسٹ تمہارے ایکسرے کا معائنہ کر رہا تھا تو اُس نے انتہائی دہشت اور مایوسی میں کہا ''لیکن انہوں نے اس شخص کے ساتھ کیا کِیا ہے۔اس کی ایک پسلی بھی سلامت نہیں ہے۔''

یہ تمہارا اپنا کیا دھرا نہ تھا۔عوام کے سپوتوں نے ان پسلیوں کو عوامی مفاد میں آہنی لاٹھیوں سے ضربیں لگا لگا کر چکنا چور کیا تھا۔انہوں نے ایک آہنی لٹھ سے تمہارے بائیں پاؤں کو کچل دیا تھا۔یہی وجہ تھی کہ تم یوں چلتے تھے کہ جیسے تمہاری ایک ٹانگ دوسری ٹانگ سے چھوٹی ہو۔ وہ گھنٹوں تمہیں رسی سے باندھ کر چھت سے لٹکا دیتے۔تمہارے کاندھے اور بازو کھنچ جاتے، کلائی کی ہڈیاں ڈھیلی پڑ جاتیں۔انہوں نے تمہاری کلائیوں کے جوڑوں کو کھینچ کر الگ کر دیا تھا، یہی کارن ہے کہ تمہاری دائیں کلائی پر ایک گومڑ سا بن گیا ہے اور جب کبھی تم کلائی پر گھڑی باندھتے ہو تو وہاں سٹیپ کے چھونے سے انتہائی تکلیف دہ سوزش ہو جاتی ___ ''میں اب رسٹ واچ بھی نہیں پہن سکتا'' تمہاری فراخ چھاتی پر ان گنت چھوٹے چھوٹے سوراخ تھے کیونکہ یہاں وہ تمہیں جلتے ہوئے سگریٹوں سے داغتے تھے؛ برسوں بعد بھی تمہاری کمر اور پشت پر آہنی کوڑوں کے نشانات ثبت تھے لیکن ان میں سب سے زیادہ ہولناک نشان اُس زخم کا نشان تھا جو تھیوفلیوناکوس نے تمہیں اپنے خط کھولنے والے دندانے دار چاقو سے لگایا تھا۔اس وقت پاپاڈوپاولس کے

بھائی کانسٹنٹائن پاپاڈوپاولس نے تمہاری کنپٹی کو ریوالور سے نشانہ بنایا ہوا تھا۔ ''بکو ورنہ میں یہ چاقو تمہارے دل میں گھونپ دوں گا، میں ابھی اس سے تمہارا دل باہر نکالتا ہوں۔'' تمہارا پھٹا ہوا ماس بہت بھدے طریقے سے تمہارے جسم میں واپس آیا تھا۔ وہ باہر کو اُبھرا ہوا ایک عجیب سا لوتھڑا لگتا تھا۔جیسے کسی کے سفید آنسو منجمد ہو گئے ہوں۔ یہ چھونے میں بے حد سخت اور کھردرے تھے، جیسے چاول کے دانے۔ ایکسرے والے دن، ڈاکٹر نے ایک ناقابل یقین انداز میں اُن پر اپنی انگلی پھیری اور اُس کی زبان لڑکھڑا گئی۔ ''میرے خدا! یہ کچھ بھی ہو سکتا ہے، میرے خدا___!'' اُس تشدد اور بربریت کا ذکر ہی کیا کہ جنہوں نے اپنا کوئی نشان نہ چھوڑا تھا۔جیسے ہی تمہیں نیند آنے لگتی، وہ تمہیں جھنجھوڑ کر جگا دیتے پھر حبس دم کا تشدد۔ انہیں محسوس ہو گیا تھا کہ تمہارے لیے تشدد کا یہ طریقہ سب سے زیادہ ناقابل برداشت اور تکلیف دہ ہے۔ لہٰذا وہ اکثر تم پر یہ طریقہ آزما کر لطف اندوز ہوتے۔ بہرحال جب سے تھیوفلیوناکوس کی انگلی دو ٹکڑے ہوئی تھی وہ تم پر ایک دبیز کمبل ڈال کر تمہارا سانس روکتے۔

ہاں اور، جنسی تشدد۔تم نے مجھے کبھی نہ بتایا کہ وہ تم پر کس طرح کا جنسی تشدد کرتے۔ اگر میں اس بارے میں تم سے براہ راست سوال کرتی، تو تمہارا چہرہ پیلا پڑ جاتا اور تم ایک طویل خاموشی میں بند ہو جاتے۔لیکن تم نے کم از کم ایک تشدد کے بارے میں کوئی راز نہ رہنے دیا: وہ تمہیں الف ننگا کر کے آہنی پلنگ کے ساتھ باندھ دیتے۔ پھر وہ تمہارے قضیب کو ہاتھوں میں لے کر ہلاتے جلاتے حتیٰ کہ وہ ایستادہ ہو جاتا اور جب وہ سختی پکڑ لیتا تو وہ اس میں ایک سویٹر بننے والی سلائی کے برابر ایک آہنی سوئی ڈال دیتے۔ پھر وہ سگریٹ لائٹر کی مدد سے اس کا بیرونی حصہ گرم کر دیتے۔اس کا اثر ایک شدید برقی جھٹکے کی مانند ہوتا۔ اس خدشہ کے پیش نظر کہ تم اس تشدد سے ہلاک تو نہیں ہو جاؤ گے، ایک ڈاکٹر ہمیشہ اپنی سٹیتھوسکوپ لیے موجود ہوتا۔

یہ قصہ وقضیہ دو ہفتوں تک چلتا رہا اور اس عرصہ میں وہ تم پر اپنے سوالات کی بوچھاڑ کرتے رہے، جن میں سے بیشتر کا جواب اگر تم چاہتے تو بھی نہ دے سکتے تھے کیونکہ ان کا تعلق جارج کی ذات سے تھا۔ ''جواب دو لیفٹیننٹ! کس کس نے تمہاری مدد کی؟ تمہیں کس بیرک سے دھماکہ خیز مواد ملا، اس منصوبہ پر عمل درآمد سے کس کو فائدہ ہونا تھا؟ تمہارے ساتھیوں کے نام اور پتے؟ اب تمہارے ساتھی کہاں کہاں چھپے ہیں؟ تمہارا بھائی الیکسینڈر کہاں ہے؟ تم نے اُسے آخری بار کب دیکھا؟ جہاز سے فرار کے بعد تم نے کس کس کے گھر میں پناہ حاصل کی؟ تمہارے لیے جہاز کی کھڑکی کس شخص نے کھولی؟'' اور تم بدستور خاموش رہتے۔تمہارا منہ صرف کراہنے یا چیخ کے لیے کھلتا۔ پھر پندرہویں روز ایک شخص بلیو سوٹ، سفید قمیض اور بلو ٹائی لگائے نمودار ہوا۔ اُس کے ہاتھ بے حد صاف اور شفاف تھے۔انتہائی عمدگی سے ترشے ہوئے ناخن، جو کسی عمدہ پالش سے چمکائے ہوئے لگتے تھے۔اُس کے بارے میں تمہارا اولیں تاثر یہی تھا۔اُس کے ہاتھوں میں ایک فائل تھمی تھی جس پر جارج کا نام رقم تھا اور اُس پر ایک مہر لگی تھی ''ٹاپ

سیکرٹ‘‘ تم نے بعد میں اُس کے چہرے پر نگاہ کی۔ اُس کے چہرے میں اُس کے ہاتھوں کی جھلک تھی۔ بے حد عمدگی اور صفائی سے کی ہوئی شیو، دھلا ہوا منہ، اُس کے نقوش بے حد تیکھے تھے۔ فراخ پیشانی، لمبی ناک، دبلا منہ اور دبیز شیشوں میں سے بہت اندر تک جھانکتی ہوئی نگاہیں۔ اُس نے ایک لحظہ کے لیے حد درجہ لاتعلقی کے ساتھ تمہارا جائزہ لیا جیسے تم ایک انسان نہیں بلکہ ایک شے ہو۔ وہ خاموشی کے ساتھ فائل کے کاغذات کو الٹتا پلٹتا رہا۔ بالآخر اُس کے ہونٹوں میں حرکت ہوئی اور اس نے ایک بے حد نخ آواز میں کہا ’’میں میجر ہزرکس (Hazizkis) ہوں۔ ای ایس اے کا کمانڈنگ آفیسر۔ کچھ بات چیت نہ کرلیں، الیکسنڈر۔ کیا تم اب کچھ بہتر محسوس کر رہے ہو الیکسنڈر؟ یا پھر میں تمہیں آلیکاس کے نام سے پکاروں؟

ایک حقیقی تفتیش کنندہ آپ کو کبھی براہِ راست ضرب نہیں لگاتا۔ وہ صرف گفتگو کرتا ہے۔ دھمکاتا ہے اور حیرت زدہ کرتا ہے۔ موثر تفتیش کنندہ اس امر سے اچھی طرح واقف ہوتا ہے کہ تفتیش محض ’’زردہ پلاؤ‘‘ کا نام نہیں بلکہ اُس نفسیاتی اذیت پر مشتمل ہوتی ہے جو نشانہ بننے والے کو جسمانی تشدد کے بعد بھگتنی ہوتی ہے۔ وہ جانتا ہے کہ جب تشدد کا نشانہ بننے والے کا جسم ایک تکلیف دہ پھوڑا بن جاتا ہے تو وہ ایسے کسی بھی شخص کی پناہ میں آنا پسند کرتا ہے جو اُسے محض لفظوں سے گھائل کرے۔ حقیقی تفتیش کنندہ جانتا ہے کہ بے پناہ اذیتیں اور دُکھ سہنے کے بعد نشانہ بننے والے کی جسمانی اور اخلاقی مزاحمت کو آنے والی اذیتوں کی اطلاع زیادہ بے حوصلہ کرسکتی ہے۔ سچا تفتیش کار تفتیش کے ڈرامہ کے دیگر کرداروں کے ہمراہ اسٹیج پر نمودار نہیں ہوتا: وہ مسلسل انتظار کرتا ہے اور اپنے آپ کو صرف اُس وقت ظاہر کرتا ہے جب تفتیش کے ڈرامہ کے پہلے ایکٹ کا پردہ گر چکتا ہے۔ صرف تب، وہ ایک اچھے ہدایت کار کی مانند دیگر کرداروں کے کام کو مربوط کرتا ہے اور اس سلسلے میں قدم آگے بڑھاتا ہے۔ وہ بے حد اطمینان اور سکون کے ساتھ سوالات کا معیار مرتب کرتا ہے اور انتہائی ذہانت کے ساتھ جوابات کا جائزہ لیتا ہے۔ وہ انتہائی تہذیب اور متانت کے ساتھ نشانہ بننے والے کی خاموشی کو قبول کرتا ہے اُس کے لیے صرف غیر معمولی یا فوری انکشاف ہی کسی اہمیت کا حامل ہوتا ہے۔ اُسے اطلاعات کے اُن ٹکڑوں سے زیادہ رغبت ہوتی ہے جن کی مدد سے وہ ایسے موزیک کو ترتیب دیتا ہے جو اُسے نشانہ بننے والے کی کمزوریوں سے آگاہ کرے۔ تاکہ ابتدائی طور پر وہ اس میں خوف اور بے یقینی کی کیفیت اس طرح پیدا کرے کہ بعد ازاں وہ کُلی طور پر ہتھیار ڈالنے پر مجبور ہو جائے۔ اسی لیے جب تفتیش کنندہ ظاہر ہو تو نشانہ بننے والے کے لیے محض یہ کافی نہیں کہ اُس کے سوالات کے جوابات دینے سے انکار کردے۔ تمہیں اپنے دماغ کو زیادہ ہوشیار رکھنا پڑتا ہے اور اُس سے ہر طرح کے مکالمہ سے انکار کرنا چاہیے۔ یہ امر فطری ہے کہ یہ ایک کٹھن کار ہے۔ کیونکہ جسمانی تشدد ذہنی کارکردگی کو بھی متاثر کرتا ہے لیکن تمہیں کوئی جتن تو بہرحال کرنا پڑتا ہے۔ بالخصوص اگر تم یہ جاننے میں دلچسپی رکھتے ہو کہ اب تک تفتیش کا سرا کہاں تک پہنچا ہے، کن کن باتوں کو وہ جان چکے ہیں اور کس کس شے سے ابھی تک بے خبر ہیں۔ اس لیے اپنے کان اور آنکھیں کھلی رکھیں اور اس کے ساتھ اپنا حافظہ اور

تخیل بھی۔ کیونکہ خوش قسمتی سے تفتیش کنندہ قوت متخیلہ سے محروم ہوتا ہے اور اصل تفتیش کار کچھ اس قسم کا بندہ ہوتا ہے جو طاقت کو ایک خارجی مظہر سمجھتا ہے۔ وہ صرف ایسے ذرائع کو مجتمع کرتا ہے جس کے ذریعے نظری مسائل پر سوچنے کی زحمت کیے بغیر ’’سٹیٹس کو‘‘ کو برقرار رکھا جا سکے۔ یہ بھی نہیں کہ وہ کوئی احمق، خود پسند یا ذاتی عظمت کا شائق ہو۔ عموماً اُس میں ذاتی حُب جاہ بھی نہیں ہوتی۔ وہ ایک مخصوص اختیار کے ساتھ گمنامی کو ترجیح دیتا ہے۔ تاکہ وہ طاقت واقتدار کے مرکزوں میں رہ سکے۔ یہ بھی نہیں کہ وہ لازمی طور پر راشی اور بدکار ہو۔ عموماً اس کے اندر انارکی اور ڈِس آرڈر کے لیے ایک شدید نفرت اور آرڈر و نیو ورلڈ آرڈر کے لیے ایک مخلصانہ محبت موجزن ہوتی ہے۔ لیکن کلیت پسندانہ اور جابرانہ طاقت تو اُس کا خدا ہے۔ اس کے لیے ’’گڈ گورنس‘‘ کا مثالی نمونہ قبرستان کی قبروں پر ایک ترتیب میں لگی صلیبوں جیسا ہوتا ہے۔ ایسا قبرستان اُسے خوش آتا ہے، جس میں کسی دلیل یا اختلاف کی گنجائش نہ ہو؛ وہ کسی نئی یا مختلف شے کے بارے میں سوچ ہی نہیں سکتا۔ کوئی نئی یا مختلف شے اُسے خوفزدہ کر دیتی ہے۔ وہ پہلے سے آزمائش شدہ نظام، نظریہ یا مسلک کا وفادار، اور اپنے عقیدے کا پارسا مہنت یا اسقف ہوتا ہے، وہ احکامات اور ضابطوں کو الہامی سمجھتا ہے اور اُن احکامات کی تعمیل اسی طرح کرتا ہے جیسے وہ خوش وضع ہونے کے پیش پا افتادہ اُصولوں کی پابندی کرتا ہے۔ بلیو سوٹ، سفید قمیض، بلیو نکٹائی، عمدگی سے ترشے ہوئے چمکتے ہوئے ناخن، سچا تفتیش کار افسردہ مخلوق ہوتا ہے۔ فلسفیانہ اعتبار سے وہ ایک مخلص فسطائی ہوتا ہے۔ بے لوث فسطائی جو ہر قسم کی فسطائیت کی خدمت کرتا ہے۔ وہ تمام کلیت پسندانہ، جابرانہ اور فوجی حکومتوں کا خادم خاص ہوتا ہے۔ بشرطیکہ وہ انسانوں کو قبرستان میں قبروں پر لگی صلیبوں کی ترتیب میں رکھ سکیں۔ جہاں کہیں بھی ایک مطلق نظریہ، مطلق قانون یا مطلق اعتقاد پایا جائے، آپ اسے اپنے کام میں جتا ہوا پائیں گے۔ جہاں کہیں اُسے ایک ایسا نظریہ مل سکے جو انسان کے اپنے آپ کو پانے میں مخل ہو۔ اُسے خوش آتا ہے۔ دنیا میں ہر ملک اور مقامات پر اُن کے دفاتر ہیں۔ تاریخ کے ضخیم ابواب کے اوراق ان کے ذکر مسعود سے بھرے ہیں۔ کل تک وہ تیسری رائخ کے تفتیشی ٹربیونل میں خدمات سرانجام دے رہے تھے، آج وہ مشرق سے مغرب میں دائیں یا بائیں بازو کی فوجی آمریتوں کی خدمت کرتے ہوئے لوگوں کو اذیت اور تکلیف کا نشانہ بنا رہے ہیں۔ وہ ازل سے ابد تک ہر جگہ موجود ہیں لیکن وہ انسان کبھی نہیں ہو سکتے۔ ممکن ہے وہ کبھی ہماری طرح محبت میں بھی مبتلا ہوتے ہوں گریہ کرتے ہوں یا دُکھ جھیلتے ہوں۔ شاید اُن میں بھی کوئی روح ہو لیکن اگر ایسا ہے بھی تو یہ روح قبر میں اتنی گہرائی میں دفن ہے کہ اسے کسی طور کھود کر بھی نکالا نہیں جا سکتا۔ اگر آپ اس شے کو نہیں سمجھتے تو آپ ان کا مقابلہ نہیں کر سکتے اور اُن کے خلاف مزاحمت محض ذاتی انا اور فخر وغرور کا عمل بن جاتی ہے۔ بلاشبہ خودداری اور ذاتی فخر ایک جائز امر، بلکہ ایک فرض ہے، لیکن خود کو محض اس تک محدود کر دینا ایک سیاسی غلطی ہے۔ تفتیش کے مقابل ڈٹ جانے کا مطلب محض یہ نہیں ہے کہ سیبس ٹائن یا روم میں پہلی صدی میں تعمیر کردہ کولوسیم کے شہیدوں کی مانند جانبازی اور سورمائی کا مظاہرہ

کریں۔اس کا ایک مطلب یہ بھی ہے کہ آپ دانشورانہ اور پیشہ ورانہ سطح پر تفتیش کنندہ کو اس قدر شرمسار کریں کہ وہ نہ صرف اپنے بارے بلکہ اُس نظام کے بارے میں بھی شک وشبہ کا شکار ہوجائے کہ وہ جس کا نمائندہ ہے اور یوں اُن سب کا انتقام بنو کہ جو اُس خوش اُسلوب اور مہذب درندگی کے ہاتھوں مسلے اور کچلے جاچکے ہوں۔

تم نے یہ مختصر مضمون اس کتاب میں لکھا ''جسے تم'' نے برسوں بعد منصوبہ بند کیا اور وہ کتاب جو تیسویں صفحے سے آگے نہ لکھی جاسکی، دراصل یہ ہزرکس(Hazizkis) کے لیے تمہاری نفرت اور حقارت کا جواز تھا۔ واحد تشدد جسے تم نے اپنے دل سے کبھی معاف نہ کیا۔ایک دہشت ناک، دکھ دائک اور سرکش نفرت کا جوالا مکھی، جو عین اس لمحے پوری شدت سے پھٹ پڑا جب اُس نے تمہیں تمہارے نام سے پکارا۔تم پر یہ آشکار کرتے ہوئے کہ وہ اس امر سے بخوبی واقف ہے کہ تم کون ہو۔''کیا تم بہتر محسوس کر رہے ہو الیکسنڈر؟ یا پھر میں تمہیں آلیکاس کے نام سے پکاروں؟''تم نے اُس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر دیکھا لیکن تم گنگ ہو کر رہ گئے۔تم اُسے اثبات یا انکار میں بہت سے جواب دے سکتے تھے لیکن لفظ شاید تمہارے منہ سے نکلنے کے لیے آمادہ نہ تھے، جیسے انہوں نے تمہاری زبان کاٹ ڈالی ہو۔دراصل بات یہ نہ تھی کہ تم پہچانے جانے سے گنگ ہو گئے تھے یا اس امر سے آگہی کہ اس شناخت کا مطلب کیا ہے؟ نکوس اور دوسرے لوگوں کی گرفتاری، جارجازیز(Georgaziz) کا اس سکینڈل میں ملوث ہونا، کیونکہ اگر وہ تمہاری شناخت کر سکتے ہیں، تو انہیں اس امر کو جاننے میں کوئی زیادہ وقت نہ لگے گا کہ مذکورہ دھماکہ خیز مواد تمہیں کس نے دیا اور یہ ایتھنز تک کس طرح پہنچا۔ دراصل اُس کی جارحانہ خوداعتمادی، لاتعلقانہ برتاؤ اور مربیانہ حقارت تھی، جس نے تمہارے اندر نفرت کا الاؤ بھڑکا دیا تھا۔تھیوفلیونا کوس اور اُس کے معاونین اور نائبین کی حیوانیت میں بھی ایک انسانیت تھی۔ وہ اتنے زیادہ انسان تھے کہ تم سے خوفزدہ ہونے کے کارن شدید اشتعال میں آ گئے۔اُن کے برعکس وہ نہ تو غصے ہی میں تھا اور نہ ہی تم سے خوفزدہ۔وہ اپنے خوبصورت ہاتھوں اور ناقابل معصیت لباس کے ساتھ ڈیسک کے پیچھے بے حد اطمینان سے بیٹھا تھا۔اُس نے بڑے سکون سے اپنی عینک اُتاری اور اُس کے شیشوں کو صاف کیا۔وہ تمہاری بجائے صرف اُن عدسوں کو دیکھ رہا تھا۔اُس نے معمولی کھنکار کے ساتھ عینک کو بدلا۔ وہ اپنے کردار سے ظاہر کر رہا تھا کہ اُسے کسی قسم کا کوئی خطرہ درپیش نہیں۔ حد یہ کہ اُس نے تمہاری نگرانی یا اپنی حفاظت کے لیے کوئی گارڈ بھی نہ طلب کیا۔اُس نے حکم دیا کہ تمہاری ہتھکڑیوں کو کھول دیا جائے اور تمہیں بیٹھنے کے لیے ایک کرسی پیش کی۔اب وہ ایک ایسے شخص کے لہجے میں بات کر رہا تھا، جیسے وہ ای ایس اے کے دفتر کی بجائے کسی بار یا ہوٹل میں گپ بازی کے لیے بیٹھے ہوں۔''تو تم نہیں بولو گے؟ خیر، خاموشی ہی رضا ہے۔اس کا مطلب ہے کہ اب تم بہت بہتر محسوس کر رہے ہو۔جب تمہارے والدین نے تمہاری گرفتاری کی خبر سنی تو تمہارے باپ کو دل کا دورہ پڑ گیا اور تمہاری ماں قریب قریب دیوانی ہوگئی۔اس کے پاگل پن کا اندازہ ہمیں اُس کی گفتگو سے

ہوا۔جب ہم تمہارے گھر کی تلاشی لے رہے تھے اور اس دوران کچھ آرام کرسیوں کے غلافوں کو اتارنے کی کوشش کی تو اُس نے کارسرکار میں مداخلت کی اسی طرح جب ہم اُس کے البم سے کچھ فوٹوگراف لے رہے تھے تو وہ شدید طیش میں آگئی۔ جب ہم نے اُس سے پوچھا کہ اُن کے اکاؤنٹ میں ایک خاص رقم کس ذریعہ سے آئی تو اُس نے ہسٹریائی انداز میں ہمیں بُرا بھلا کہا اور ہماری سخت بے عزتی کی۔ مجبوراً ہمیں اُسے اور ساتھ ہی تمہارے باپ کو بھی گرفتار کرنا پڑا۔ میں تمہیں یہ بتانے میں بھی کوئی مضائقہ نہیں سمجھتا کہ ایک بڈھے جوڑے کو اس حال میں گرفتار کرنا ہمارے لیے ہمیشہ ایک ناخوشگوار فرض ہوتا ہے، لیکن ہمارے پاس اس کے سوا اور کوئی راستہ نہ رہا تھا۔اس وقت وہ ای ایس اے کے ہیڈ کوارٹر میں چند ماہ کے لیے بند کر دیئے گئے ہیں۔افسوس، بے حد افسوس، لیکن تم بہت سے لوگوں کے لیے مصائب کا باعث بن رہے ہو۔اگر سرحدوں اور سفارتی استثناؤں کی پابندیاں نہ ہوتیں تو ہم اپنی ساری جیلیں بھر دیتے۔مگر اس ساری تفصیل میں تمہیں کوئی دلچسپی نہیں، یہی ہے نا؟''ایک بیٹھی ہوئی آواز نے کہا''نہیں''''خیر یہ کہنا بلاشبہ تمہارا استحقاق ہے اور اگر میں زیادہ غلطی پر نہیں تو ایک سچا انقلابی نرم و نازک احساسات سے ماورا ہوتا ہے۔یا پھر وہ خود کو ایسے احساسات رکھنے کی اجازت نہیں دیتا۔وہ ہر جگہ اور ہر وقت، والدین، دوستوں اور عزیزوں کو انقلاب کی خاطر قربان کرنے کے لیے آمادہ رہتا ہے اور اس قربانی کے لیے اُسے کوئی کوشش بھی نہیں کرنی پڑتی، کیونکہ یہ رشتے اُس کے لیے بے معنی ہوتے ہیں۔اُس کا دل نہیں ہوتا۔کیا تمہارا دل ہے؟''''نہیں!''''مجھے یہی خوف تھا۔ بہرحال شدید پیاس سے تمہارے ہونٹ چمڑا ہو رہے ہیں اور اسی لیے شاید تمہیں لفظوں کی ادائیگی میں تکلیف پیش آ رہی ہے۔ پانی پیو گے؟''''ہاں''''بالکل ٹھیک، ابھی منگاتا ہوں۔''اُس نے گھنٹی بجائی۔انتہائی مودب اور اپنے دوسرے نصف کے بغیر بابالیس(Babalis) اندر داخل ہوا۔''یس میجر!''''ہمارے دوست کو ایک گلاس پانی چاہیے، اس کے ہونٹ خشک ہو رہے ہیں''پھر اُس نے تم سے دوبارہ خطاب شروع کیا''ہاں اور ہم کیا بات کر رہے تھے؟ اوہ، ہاں یاد آیا، معاملات دل کے بارے میں: تم نے شادی بھی نہیں کی؟ تمہاری کوئی مستقل نوعیت کی گرل فرینڈ بھی نہیں۔بس کبھی کبھار جب تمہیں موقع میسر آجائے اور تمہارے پاس وقت بھی ہو تو ادھر اُدھر منہ مار لیتے ہو۔لیکن تم نے کوئی مستقل روگ نہیں پالا۔کوئی محبت یا عشق نہیں۔تمہاری واحد محبت سیاست ہے۔میں یہ شرط لگانے کو تیار ہوں کہ تمہیں کبھی کسی سے محبت نہیں ہوئی لیکن میں اس امر کو بھی پوری طرح سمجھ سکتا ہوں۔ایک بھلے انقلابی کو اس قسم کے بکھیڑوں میں نہیں پڑنا چاہیے۔یا پھر تمہارے بارے میں میری اطلاع غلط ہے، کیوں؟ کیا تمہاری کوئی عورت ہے؟''ایک اور بھرائی ہوئی آواز''اور تم ہیزرکس(Hazizkis)''''نہیں، میں بھی کنوارہ ہوں اور میں نے بھی تمہاری مانند کبھی کسی سے کوئی محبت نہیں کی۔ چلو ہم دونوں کے بیچ کوئی نہ کوئی قدر مشترک تو نکلی، جلد یا بدیر ہم ایک دوسرے کو سمجھ پائیں گے لیکن یہ لو پانی!''بابالیس پانی کا گلاس لیے واپس آیا اور اس سے پہلے کہ وہ اس امر کو محسوس کرتے کہ تم اس گلاس کو اپنے ہونٹوں تک نہیں لے کر جا

رہے، وہ سب کچھ وقوع پذیر ہو گیا۔ انہیں دھماکے کی آواز سنائی دی۔ گلاس ٹوٹ چکا تھا اور انہیں اپنے جسموں پر نمی کا احساس ہوا۔ تم ٹوٹے ہوئے شیشوں کے ساتھ ہیززکس(Hazizkis) کا گلا کاٹنے کے لیے اس کے ڈیسک کے جانب لپکے لیکن وہ عین وقت پر انتہائی پھرتی سے ایک طرف ہو گیا۔ بابالیس(Babalis) سے حرکت کرنے میں ذراسی تاخیر ہوئی۔ تمہارے اور بابالیس(Babalis) کے درمیان کوئی رکاوٹ نہیں تھی اور اُس پر ایک کاری ضرب لگانا کہیں آسان تھا۔ ایک زخم کاری۔ بہر حال یہ ایک متبادل ہی تھا کیونکہ تمہارا بنیادی مقصد تو ہیززکس(Hazizkis) کو نشانہ بنانا تھا اور اسی مقصد کی خاطر تم نے پانی طلب کیا تھا۔ تم انتہائی طیش میں لرزتے اور کانپتے ہوئے ٹوٹے ہوئے گلاس کے ساتھ اُس پر حملہ آور ہوئے کیونکہ وہ اس قدر اطمینان اور پُرسکون طریقے سے تمہاری تفتیش کر رہا تھا لیکن اُس نے اس سارے ہنگامے کے باوجود پلک تک نہ جھپکائی۔ اُس کے چہرے کے تاثرات بھی بدستور وہی رہے۔ اُس نے اتنے ہی اطمینان کے ساتھ کمک طلب کرنے کے لیے گھنٹی بجائی اور بعد میں پیش آنے والے منظر سے پوری طرح لطف اندوز ہوا۔ تازہ کمک میں وہ تین سرجنٹ بھی شامل تھے جو تمہیں آہنی پلنگ پر لٹانے والے دن تمہارے سر پر موجود تھے۔ انہوں نے پوری مہارت سے تمہیں دبوچ لیا تاکہ تم ٹوٹے ہوئے گلاس کے ٹکڑوں تک نہ پہنچ سکو۔ تم اُن کے ساتھ محاذ آرا ہوئے اور اسی اثناء میں بابالیس انہیں ہلاشیری دیتے ہوئے چلّاتا رہا: ''اس خبیث کو قابو کرو! جانے نہ پائے!'' جنگ اب بھی جاری تھی۔ اگرچہ انہوں نے تمہیں سختی سے جکڑ لیا تھا لیکن تم نے ٹوٹے ہوئے شیشے کو اپنے ہاتھ سے نہ نکلنے دیا تھا۔ تم نے اسے یوں پکڑ رکھا تھا، جیسے رگبی کا کھلاڑی پوری سختی اور گرفت کے ساتھ فٹ بال کو اپنے سینے کے ساتھ چمٹا کر رکھتا ہے۔ تمہیں اس شیشے کی کوئی پرواہ نہ تھی کہ جو اس بُری طرح تمہاری انگلیوں اور ہاتھ کو چیرے جا رہا تھا! اور بالآخر جب وہ تمہارے ہاتھوں کو کھولنے میں کامیاب ہوئے، تو تمہاری چھوٹی انگلی قریب قریب کٹ چکی تھی اور اس کی نسیں تمہارے جسم سے الگ ہو چکی تھیں۔ ''خیر، کوئی بات نہیں، میرا خیال ہے آج ہم گفتگو نہ کر پائیں گے۔'' ہیززکس(Hazizkis) نے اُسی اطمینان اور شانت لہجے میں کہا۔ پھر اُس نے تمہیں بابالیس(Babalis) کے حوالے کر دیا۔ اُس نے تمہارے دونوں ہاتھ کمر کے پیچھے کس کر باندھ دیئے اور ڈاکٹر کو حکم دیا کہ تمہاری انگلی سُن کرنے کی دوا دیئے بغیر سیئے۔ ایک ہفتہ بعد ہیززکس دوبارہ ظاہر ہوا۔ بلیو سوٹ، سفید اُجلی قمیض، انتہائی صفائی سے ترشے ہوئے ناخن اور تم سے پوچھا ''اب تمہاری انگلی کے کیا احوال ہیں؟ انہوں نے مجھے بتایا ہے کہ تم ایک دلیر شخص ہو اور تم نے انگلی کے زخم کی سلائی کے لیے سُن کرنے والی دوا لینے سے انکار کر دیا تھا۔ شاباش، بہت اچھے، برسبیل تذکرہ تم وہی ہو نا جس نے میجر تھیوفلیوناکوس(Theophiloiannkos) کی انگلی چبا ڈالی تھی؟ اب تم دونوں کے ہاتھوں کی انگلیوں پر پٹیاں بندھی ہیں اور اگر میں زیادہ غلطی پر نہیں تو تم دونوں کی انگلیاں بھی ایک ہی طرف کے ہاتھ کی تھیں اور جیسے کے مسلمانوں کا طریق ہے آنکھ کے بدلے آنکھ اور چھنگلی کے بدلے چھنگلی، آؤ! کچھ دیر گفتگو نہ ہو جائے۔''

یہ وہ ہمیشہ ہی کہا کرتا تھا ''آؤ کچھ دیر بات چیت نہ کر لیں'' وہ اڑھائی مہینے تک مسلسل یہ الفاظ بولتا رہا اور کسی وقفے کے بغیر وہ تمہیں جسمانی اور روحانی طور پر شدید اذیت سے دوچار کرتے۔ جسم تھیوفلیوناکوس(Theophiloiannakos) کی ملکیت تھا اور روح ہیززکس(Hazizkis) کے قبضے میں تھی لیکن وہ تم سے کچھ نہ اگلوا سکے۔ تم اپنا منہ صرف اس وقت کھولتے، جب یا تو تمہیں انہیں بے عزت کرنا مقصود ہوتا یا تمہیں یہ کہنا ہوتا ''ہاں! یہ سب میں نے اپنی ذمہ داری پر کیا ہے۔ یہ ٹھیک ہے کہ میں اس میں ناکام رہا جس پر مجھے بے حد افسوس ہے۔ اگر مجھے موت کے گھاٹ نہ اُتارا گیا، تو ایک بار پھر میں اُسے ہلاک کرنے کی کوشش کروں گا۔'' مگر تمہارے دوسرے ساتھیوں نے سب کچھ بک دیا تھا۔ ایک ایک کر کے وہ سارے کے سارے پکڑے گئے۔ کوئی دن ایسا نہ جاتا تھا جب وہ کسی نہ کسی کو تمہارے پاس نہ لاتے ہوں، اس اُمید پر کہ تم اپنی شکست تسلیم کر لو اور وہ تمہیں سمجھا سکیں کہ اب کسی بھی طرح کی مزاحمت بالکل بے کار تھی۔ اُن کی نگاہیں تمام تر قوت ارادی سے محروم ہو چکی تھیں اور وہ اپنے سوجے ہوئے چہرے لیے تم سے کہتے ''بس کرو، آلیکاس، اب اس مزاحمت کا کیا فائدہ ہے۔ ہم اُن کا مقابلہ نہ کر سکے۔ ہم نے انہیں سب کچھ بتا دیا ہے۔'' اور تم آہنی پلنگ سے بندھے یا چھت سے لٹکے ہوئے جواب دیتے ''یہ کون ہے؟ یہ کیا چاہتا ہے؟ میں اسے نہیں جانتا'' ستمبر کے اواخر میں دوسروں کے بیانات کو استعمال کرتے ہوئے، ہیززکس(Hazizkis) اور تھیوفلیوناکوس(Theophiloiannakos) نے ایک اقبالی بیان تیار کیا اور تمہیں اُس پر دستخط کرنے کو کہا۔ ''محض ایک دستخط اور پھر تمہیں کوئی کسی طرح کی اذیت نہ دے گا۔'' تم نے ایک بار پھر انکار کیا۔ انہوں نے تم پر ایک بار پھر فلانجی کا طریقہ آزمایا اور تشدد کے دوران تمہیں اقبالی بیان پر دستخط کرنے کے لیے کہا۔ تم نے دوبارہ انکار کیا۔ انہوں نے تمہیں آہنی کوڑوں سے ادھیڑ ڈالا اور فلانجی کا طریقہ پھر آزمایا اور ایک بار پھر تم نے انکار کیا۔ تم انہیں مسلسل انکار کرتے رہے۔ تم اُن کے تشدد سے ہلاک ہو چکے ہوتے، اگر ایک رات ای ایس اے کا سپریم چیف، بریگیڈیئر جنرل آئیونیڈیز(Ioannidis) اچانک خود وہاں نہ آجاتا۔

یہ ایک سرد رات تھی۔ ایتھنز میں اُس برس اکتوبر بے حد ٹھنڈا تھا اور تم ٹوٹے سپرنگوں والے آہنی پلنگ پر گھٹنوں اور کلائیوں سے بندھے ننگے لیٹے ہوئے تھے۔ لہو کی ایک تار سی تمہارے منہ سے ٹپک رہی تھی، کیونکہ انہوں نے ایک زوردار گھونسہ مار کر تمہارا ایک اور دانت توڑ دیا تھا۔ ایسے لگتا تھا جیسے تم نے اپنے چہرے پر سفید نقاب چڑھایا ہو، کیونکہ تم ہفتوں سے نہ سو پائے تھے اور کئی دنوں سے تم نے کچھ کھایا پیا بھی نہ تھا۔ تم بڑی کوشش سے سانس کھینچ رہے تھے اور تمہارے گلے سے خرخراہٹ کی آوازیں نکل رہی تھیں اور تھیوفلیوناکوس(Theophiloiannakos) کھڑے کھڑے چلّا رہا تھا ''بدمعاش، اس سے کیا فرق پڑتا ہے چاہے تم کچھ بکو یا نہ بکو، ہم بہر حال یہی کہیں گے کہ یہ سب کچھ تم نے خود ہمیں بتایا ہے۔ تم چاہے دستخط کرو یا نہ کرو، ہم یہی کہیں گے کہ اس بیان پر خود تمہارے دستخط موجود ہیں۔'' اچانک دروازہ پوری

طرح کھلا اور بریگیڈ ئیر جنرل آئیونیڈیز(Ioannidis) اپنے پورے کروفر اور فوجی چال کے ساتھ داخل ہوا، باہر کو نکلی، پھلائی ہوئی چھاتی، ہاتھ کمر کے پیچھے کی جانب بندھے ہوئے، وہ تمہارے آہنی پلنگ کے قریب رُکا۔ تمہیں اُسے پہچاننے میں کوئی دیر نہ لگی۔ تم جانتے تھے کہ وہ کون تھا: وہ ای ایس اے کا سپریم چیف اور یونان کا مردِ آہن تھا۔ وہ اس قدر طاقتور تھا کہ خود پاپاڈو پاولس بھی اس سے خوفزدہ رہتا تھا۔ وہ ایک کم گو، اکھڑ اور بدمزاج شخص تھا۔ جو کوئی بھی اُس سے ملنے کی کوشش کرتا یا کسی سفارش کے لیے آتا، وہ اُن سے ترش روئی سے پیش آتا۔ وہ ہر ملنے والے شخص میں خوف و ہراس کے جذبات ابھارتا تھا۔ ہر شخص، اُس کی سختی، ضدی مزاج اور کرپشن کو ناپسند کرنے کی عادت سے واقف تھا۔ وہ شہرت کا بھوکا نہ تھا اور قطعاً یہ نہ چاہتا تھا کہ کہیں توجہ کا مرکز بنے۔ اُسے پس پردہ رہنا پسند تھا۔ اس کے بارے میں کہا جاتا تھا کہ اگر اس کے خیال میں ضروری ہو تو وہ اپنی ماں کو بھی گولی مار سکتا تھا۔ حتیٰ کہ اپنے گلابوں کے باغ کو تاراج کر سکتا تھا۔ حالانکہ یہ وہ واحد شے تھی جس سے وہ محبت کرتا تھا۔ اس کے بارے میں یہ بھی کہا جاتا کہ وہ ببانگ دہل آمریت کے بارے میں حقارت آمیز جذبات رکھتا تھا اور اس نے اِس فوجی انقلاب میں اس لیے معاونت کی تھی کیونکہ اس کی شرکت کے بغیر فوجی انقلاب کی کامیابی کا کوئی امکان نہ تھا۔ ٹھیک آٹھ برس بعد جب تاریخ کی ستم ظریفی اسے تمہاری جگہ اس جیل میں لے آئی۔ تو مجھے یہ جان کر بے حد حیرت ہوئی کہ تم اس کا احترام اس طرح کرتے تھے جیسے کوئی اپنے مخالف کی قدر کرتا ہے اور اسے دشمن نہیں جانتا۔ یہی وجہ ہے کہ تم اس سے کبھی نفرت نہ کر سکے۔ کیا تمہاری اس سے عدم نفرت کی صلاحیت اس رات ان لفظوں سے پیدا ہوئی، جو اس نے تھیوفلیوانکوس(Theophiloiannakos) کے سامنے ادا کئے۔ اس کا چہرہ بے حد کرخت کھنچا ہوا تھا۔ اس کی برف آنکھیں تم پر جمی تھیں، آئیونیڈیز(Ioannidis) کچھ لحظے کے لیے خاموش رہا۔ اس نے انتہائی اکھڑ پن سے تھیوفلیوانکوس(Theophiloiannakos) کو ایک جانب دھکیلا اور اسے کھلے لفظوں میں حکم دیا ''بہت ہو گیا، اب اسے چھونا بھی نہیں۔ اس کے ساتھ زیادہ اصرار بے کار ہے، وہ نہیں بولے گا، لاکھوں، کروڑوں میں کوئی ایک مائی کا لال ایسا ہوتا ہے جو ایسی صورت میں بھی زبان بند رکھتا ہے۔ اس کے ساتھ یہی معاملہ ہے۔'' پھر اس نے اپنا ہاتھ تمہاری جانب بڑھایا، اس کا باقی ماندہ متاثر کن وجود بدستور برف رہا۔ اس کے چہرے کے عضلات کھنچے ہوئے اور بے حرکت رہے۔ پھر اس نے تمہاری مونچھ کے آخری حصہ کو پکڑ کر ایک ہلکا سا جھٹکا دیا: ''پاتا گاونس، میں تمہیں شوٹ کر دوں گا۔'' انیس دن بعد جب نومبر شمال کی سرد ہواؤں کی ہمرکابی میں آیا، تو مقدمہ کی کارروائی شروع ہوئی۔

☆☆☆

غزلیات

قیوم طاہر

دُکھ محبت کا مقدر بھی تو ہو سکتا ہے
یہ جو آنسو ہے، سمندر بھی تو ہو سکتا ہے

میں تجھے لفظ میں، رنگوں میں کہاں تک دیکھوں
تو مرے شعر سے بڑھ کر بھی تو ہو سکتا ہے

یار کے ہاتھ پہ رکھے ہوئے پھولوں پہ نہ جا
یار کے ہاتھ میں پتھر بھی تو ہو سکتا ہے

خاک اوڑھے ہوئے لوگوں سے ملا کر، کہ کوئی
آسمانوں کے برابر بھی تو ہو سکتا ہے

یہ ترا ہاتھ ہے یا دھوپ ہے ہاتھوں میں مرے
یہ کسی خواب کا منظر بھی تو ہو سکتا ہے

اتنا اونچا بھی نہ اب طرّۂ دستار بنا
یہ کسی پاؤں کی ٹھوکر بھی تو ہو سکتا ہے

رُوح کے زخم کو بھرنے نہیں دیتا جو کبھی
تیرے لہجے کا وہ نشتر بھی تو ہو سکتا ہے

مجھ کو دشمن نے کہاں آدھا کیا ہے قیومؔ
میرا دشمن، مرا رہبر بھی تو ہو سکتا ہے

پرویز ساحر

افسوس ایک نان سے ستا چلا گیا
بچپن میں میرے ہاتھ سے بستہ چلا گیا

میرے قدم اُسی طرف اٹھتے چلے گئے
جس جس طرف بھی لے کے وہ رَستہ چلا گیا

تا عمر آرزُو کی مجھے آرزُو رہی
تا عمر ایک شے کو ترستا چلا گیا

اِک ذات تھی کہ جس نے تھا گھیرے ہوئے مجھے
اِک خوف تھا کہ جو مجھے ڈستا چلا گیا

کتنا عجیب شخص تھا، مجذُوبِ رہگزر
دیوانہ وار سب پہ وہ ہنستا چلا گیا

ہر خار و گل کے ساتھ برابر کیا سلوک
ابر کرم کہ سب پہ برستا چلا گیا

اس شہر کی کہانی بھی ساحرؔ عجیب ہے
اک دشت تھا جو لوگوں سے بستا چلا گیا

غزلیات

عطاء الرحمٰن قاضی

مثالِ عکس ، غمِ انعکاس میں رہنا
تمام عمر ، رہِ التباس میں رہنا

چلو کہ کوئی تو کارِ زیاں کریں ہم بھی
یہ کیا کہ روزِ ابد تک حواس میں رہنا

عجب نہیں کہ ملے انتعاشِ درد میں کیف
بسانِ عشق ، دلِ غم شناس میں رہنا

ملا تھا بحرِ تمنا میں لمحہ بھر کو سراب
پھر اس کے بعد برابر تھا پیاس میں رہنا

جنوں کو پیرہنِ اعتبار بخشے گا
ہم اہلِ شوق کا غم کے لباس میں رہنا

یہ زندگی کا تسلسل نہ ٹوٹ جائے ، عطاؔ
جو ہو سکے تو بہاروں کی آس میں رہنا

عطاء الرحمٰن قاضی

کثرت کی طلب میں کھو گئے ہیں
کتنے ویران ہو گئے ہیں

جاگے تھے رات بھر سو ہم لوگ
آئی ہے سحر تو سو گئے ہیں

کیا سحر ہے دشتِ آگہی میں
آئے نہ پلٹ کے جو گئے ہیں

سنتے ہیں کہ تربتِ ہنر پر
کچھ لوگ پھر آ کے رو گئے ہیں

کشتِ احساس میں عطاؔ ہم
اک کرب کی فصل بو گئے ہیں

غزلیات

منیر عصری

جی کا آئینہ ، صاف کرنے کو
ہم رہے ، اعتراف کرنے کو

کھال وہ اہلِ دل کی کھینچیں گے
تیغِ وحشت غلاف کرنے کو

وہ تو پتھر تھے ، سنگدل ہی رہے
رہ گئے ہم ، طواف کرنے کو

سارا کنبہ ہمارا قتل ہوا
بچ گئے ہم ، معاف کرنے کو

بات ٹھہری رہی کہیں دل میں
درد کا انکشاف ، کرنے کو

وقت اپنے تضاد ، جتنا ہے
وقت سے ، اختلاف کرنے کو

رات بھر جاگتے رہے عصریؔ
خواب سے ، انحراف کرنے کو

منیر عصری

موت کی نغمہ کاریاں ، زِندوں کو مارتی رہیں
موجِ ہوس کی صورتیں ، نشے اتارتی رہیں

آئے نہ چاند لوٹ کر شورِ نفس کی بھیڑ سے
بسترِ مرگ پر پڑیں ، مائیں پکارتی رہیں

آپ تو سرخرو ہوئے ، ذات کی نرد جیت کر
فاقہ زدہ محبتیں ، بچوں کو ہارتی رہیں

ہجر کے دن جو تتلیاں، آہوں سے بے نیاز تھیں
وصل کی چاند رات بھی ، سوکر گذارتی رہیں

کھیتوں کی نرم خوشبوئیں، بموں کی بو میں کھو گئیں
کل تک تو یہ کسان کے جذبے اُبھارتی رہیں

شانی فریاد

احساس

میرے در پر کئی صدیوں میں گم صم زندگی خاموش بیٹھی ہے
یوں لگتا ہے کہ جیسے ادھ کھلی کھڑکی سے کوئی درد کا جھونکا
ہوا کا سرد سا جھونکا
مجھے آواز دیتا ہے
میں صدیوں سے یونہی بے کل
میں صدیوں سے یونہی تنہا
نہ جانے کون سے کِس وقت کے لمحوں سے بچھڑی ہوں
میں میلوں کی مسافت سے زمانوں کی کثافت کو
کھلی آنکھوں سے ایسے تک رہی ہوں
کہ جیسے میں کوئی حیران بچہ ہوں
مجھے کچھ یاد پڑتا ہے!
مجھے کچھ یاد پڑتا ہے
کِسی ویران سے کونے میں جانے کتنی مدت سے
کسی مکڑی نے اِک جالا بُنا تھا
وہ نیلے پانیوں میں دودھیا سی لمبی سیپی میں
سکوں کا سبز موتی تھا
مجھے کچھ یاد پڑتا ہے
فلک پر دو ستارے تھے
ستارے تھے یا آنکھیں تھیں
وہ مجھ کو دیکھ کے ہنستی تھیں
اور پھر ڈوب جاتی تھیں
مرے ہاتھوں میں اِک مضبوط سے احساس کا دھاگا
نہ جانے کون سے لمحے کسی آسیب نے
ایسے تھمایا ہے
کہ جس کی اصل کی جانب
میں کھنچی جا رہی ہوں یوں
کہ خود سے بے خبر، ہو کے
گماں کی الجھنوں میں پھنس رہی ہوں
مجھے کوئی پکارے اور مجھے کوئی بلائے تو
یا بس اتنا بتائے تو
میں کیا ہوں کون ہوں؟
اور کس طرف کو جا رہی ہوں میں؟

حروفِ زر

(قارئین کے خطوط)

سب سے پہلے مجھے اس ندامت کا اظہار کرنا ہے کہ آپ کے رسالہ ''انگارے'' کی رسید ارسال خدمت نہ کر سکا۔ حالاں کہ میں اس کے سب شمارے بالا استیعاب پڑھ چکا ہوں اور بعض مضامین نے نہ صرف ردِّعمل پیدا کیا بلکہ اظہار کی تحریک بھی دی۔ میں اپنی اس ندامت کا اظہار شاکر حسین صاحب سے بھی کر چکا ہوں۔ توقع ہے کہ انہوں نے میرے جذبات آپ تک پہنچا دیئے ہوں گے۔ میں گزشتہ ڈیڑھ دو سال سے عمرِ ضعیفی کے تمام تحائف وصول کر رہا ہوں۔ گزشتہ برس ۴ دسمبر کو پچھترویں (۷۵) سال میں قدم رکھا تو ضعیفی نے اضمحلال میں اضافہ کر دیا۔ بلکہ ایک وقت تو ایسا بھی آیا کہ آنکھوں میں بھی دم نہ رہا۔ موسم سرما کے آغاز پر کچھ طبیعت سنبھلی اور اس قابل ہوا کہ آپ کے سابقہ دس شماروں کی رسید پیش کر دوں۔

''انگارے'' اکیسویں صدی کے تیسرے سال میں بلاشبہ ہوا کا تازہ جھونکا ہے جو ''گرد و گرما گدا و گورستان'' کے شہر سے مسلسل آ رہا ہے۔ اس کے مضامین طرفداری سے بالا اور غیر جانبداری کے آئینہ دار ہیں اور مباحث صرف ترقی پسندی کے مخصوص اصطلاحی معانی تک محدود نہیں بلکہ اس پرچے میں متنوع اور خیال انگیز مضامین بھی رہے ہیں۔ میں یہاں صرف غلام حسین ساجد کی مثال دوں گا جن کے باطن کے نقاد کی رونمائی زیادہ تر ''انگارے'' میں ہوئی۔

اہم بات یہ ہے کہ آپ ''انگارے'' میں مدیر نظر آتے ہیں، محض مرتب دکھائی نہیں دیتے۔ اداریے میں آپ معاصر مسائل پر جرأت مندی سے قلم اٹھا رہے ہیں۔ کسی گزشتہ شمارے میں ادیبوں کی مالی بدعنوانیوں کو موضوع بنایا اور بجا طور پر لکھا گیا تھا کہ ادیبوں کو عام انسان کی نفع اندوزی سے بلند تر ہونا چاہیے۔ اگرچہ آپ کا روئے سخن کسی مخصوص شخصیت یا ادارے کی طرف نہیں تھا لیکن بعض لوگوں نے اس اداریے کو ''مجلس ترقی ادب'' سے منسلک کر دیا جس کے معاملات کی انکوائری اب مکمل ہونے والی ہے یا ہو چکی ہے اور ۳۷ لاکھ روپے کی رقوم کے غلط استعمال یا امانت میں خیانت زیرِ تحقیق ہے۔ دوسری طرف اس اداریے پر بیورو کریسی نے اپنے ہاتھ دکھانے شروع کر دیئے ہیں اور ملک کے نامور ادیب، شاعر اور افسانہ نگار احمد ندیم قاسمی نے جو اس ادارے کو ۸۷ برس کی عمر میں بھی چلا رہے تھے استعفیٰ دے دیا ہے۔ انتظار حسین اور ظفر اقبال نے اس پر کالم لکھے ہیں۔ بعض لوگوں نے خیال ظاہر کیا ہے کہ ان کے خلاف انکوائری میں ایک مقامی اخبار نے بھی اپنا کردار مخصوص انداز میں ادا کیا اور قاسمی صاحب کے خلاف منفی خبریں شائع کیں، معاف کیجیے اس ضمن میں آپ کے اداریے کو بھی مؤقر قرار دیا جا رہا ہے۔ اب میں آپ سے درخواست کروں گا کہ آپ ان کے حق میں ایک اداریہ لکھیں۔ قاسمی صاب کو ''دو پیسے کے کام''

سے نجات دلائیں اور حکومت کو متوجہ کرائیں کہ وہ ادیبوں کے بہبود فنڈ سے کم از کم پچاس ہزار روپے ماہانہ کا وظیفہ ان کے لیے مقرر کر دیں اور انہوں نے ''ماڑی موٹی'' انتظامی کوتاہیاں اگر کی ہیں تو وہ نظر انداز کر دی جائیں۔ ۲۷ لاکھ روپے بڑی رقم نہیں جس کا حساب کتاب مانگا جائے۔ اتنی معمولی رقم پر تو کوئی بھی باز پُرس نہیں کرتا۔ اکتوبر کے شمارے میں قاسمی صاحب نے آپ کی طرف شفقت اور محبت کا ہاتھ بڑھایا تھا تو آپ کو اس کی قدر کرنی چاہیے۔ ''انگارے'' کے اداریے کا ازالہ ضروری ہے بلکہ ''انگارے'' میں ان کی امداد کے لیے تحریک پیدا کریں۔ قاسمی صاحب کو مجلس ترقی ادب کی مشقت سے نجات دلا کر ان کے شایانِ شان آمدن فراہم کرنی چاہیے۔ میری تجویز ہے کہ ان کو ریٹائر کر کے ان کا مجسمہ مجلس ترقی ادب کے دفتر کے باہر ایستادہ کیا جائے۔ انہوں نے امتیاز علی تاج اور حمید احمد خان سے زیادہ لمبے عرصے تک اس عہدے پر کام کیا ہے۔ ان کو الوداعی سلام کے لیے بڑے پیمانے پر لاہور میں اور پھر ہر ستمبر میں تقریب ہونی چاہیے۔ ایک تقریب کی صدارت صدرِ پاکستان کریں۔ چھوٹی تقاریب کی صدارتیں اضلاع کے ڈپٹی کمشنر کریں۔ ہم سب کا فرض ہے کہ انہیں پھولوں سے لاد دیں۔

اب کچھ صحت ہوئی ہے تو انشاء اللہ آپ سے رابطہ قائم رہے گا۔

(ڈاکٹر انور سدید۔ لاہور)

''انگارے'' کا دسواں شمارہ ملا۔ اس میں میرا خط بھی چھپا ہے۔ ممکن ہے اس موضوع پر آگے کوئی گفتگو ہو۔ ہمیں ایسے موضوعات پر کھل کر بات کرنی چاہیے۔

آپ کے رسالے میں اس بار بھی اچھے مضامین اور خطوط شائع ہوئے ہیں۔ نصیر ترابی کی کتاب ''عکس فریادی'' پر معین الدین عقیل کا مضمون بھی اچھا ہے۔ کتب چھپ کر آئے بہت عرصہ ہوا ہے، کسی تنقید نگار نے پہلی بار توجہ دی ہے۔ نصیر چونکہ کسی گروہ سے وابستہ نہیں ہے اس لیے اس کے ساتھ بے اعتنائی برتی گئی حالانکہ بہت اچھا شاعر ہے۔ یہ کتاب بھی کئی کتابوں سے اچھی ہے۔ اس کا اپنا ایک لہجہ ہے۔ روایت آشنائی نے اس کی بنیادیں مضبوط کر دی ہیں۔ زبان و بیان میں روایت سے روشنی بھی لیتا ہے اور اپنے عہد کے تقاضوں سے ہم کنار ہوتا ہے۔ جدید شعرا میں اُس کا ایک اہم مقام ہے۔ آج نہیں تو کل زمانہ اسے تسلیم کرے گا۔ راشد پر بھی اچھا مضمون ہے۔ ابھی یہی دو مضامین پڑھے ہیں اور خطوط کا حصہ دیکھا ہے۔

ظہیر کاشمیری پر مضمون میں نے علیحدہ لفافے میں بھیجا تھا (بذریعہ ڈاک) یقین ہے کہ اب تک مل گیا ہوگا۔ ظہیر صاحب کا انتقال ۱۲ر دسمبر ۱۹۹۴ء کو ہوا تھا، دو ماہ بعد اُن کی برسی ہے، مضمون اسی دوران شائع کر دیجیے، انہیں تو لوگوں نے بھلا ہی دیا ہے۔ پچھلے دنوں آئے اے۔ آر۔ وائی (ٹی وی) سے صوفی تبسم صاحب پر ایک تفصیلی پروگرام پیش کیا گیا تھا۔ اس میں ظہیر کاشمیری کے درشن بھی ہو گئے۔ وہ بھی اظہارِ خیال کر رہے تھے۔ میری آنکھوں میں تو آنسو آ گئے۔ دس سال بعد ''زندہ ظہیر کاشمیری'' کو دیکھا تھا۔ میرے اُن سے بہت پرانے مراسم تھے۔ یہ ترقی پسند تحریک کے ہراول دستے کے لوگ تھے اور بہت

فعال۔ مخدوم اور سردار جعفری کی طرح جیلوں میں بھی رہے۔ مزدور تحریکوں میں بھی پیش پیش تھے اور ادب میں بھی، جس کی وجہ سے اُن کا ''تخلیقی ادب'' تو متاثر ہوا مگر جو کچھ لکھا وہ اپنے عہد کا روشن آئینہ ہے اور ہمارے لیے سنگ میل۔ اُن کا تو ایک ہی شعر انہیں ہمیشہ زندہ رکھے گا،

ہمیں خبر ہے کہ ہم ہیں چراغ آخر شب
ہمارے بعد اندھیرا نہیں اُجالا ہے

یہ شعر ہر دور کے اہلِ قلم کو پُر امید رکھتا ہے۔

(حمایت علی شاعر۔ کراچی)

آپ ''انگارے'' کے مداحوں کی فہرست بنائیں تو مجھ بندہ ناچیز کو بھول نہ جایئے گا۔ ہر مہینے اس کی نئی کتاب کو پڑھتا ہوں۔ ''انگارے'' یہ اشارہ بھی دیتا ہے کہ سنجیدہ ادبی کارنامے ہنگامہ آرا شہروں کے مقابلے میں نسبتاً چھوٹے شہروں اور قصبوں میں سرانجام پاتے ہیں۔

اس بات میں کوئی سچائی ہے تو وہ ضرور ملال انگیز ہوگی کیونکہ تب ہم کو ماننا ہوگا کہ اربنائزیشن تخلیقی ادبی عمل کے لیے سازگار نہیں۔ تب کوئی یہ بھی کہہ دے گا کہ ادب جاگیرداری عہد کی یادگار ہے۔ خیر، گزشتہ شمارے میں آپ نے ابنِ حسن کے ساتھ کوئی اچھا سلوک شاید نہیں کیا۔ انہوں نے آپ کو خط ہی لکھا ہوگا، لیکن اتنے طویل خطوط، جب ان کا تعلق کسی ایک ہی موضوع سے ہو، الگ مضمون کے طور پر شامل ہو سکتے ہیں۔ احمد ندیم تونسوی کو داد دینے کو جی چاہتا ہے۔ ایڈورڈ سعید پر انہوں نے ضرور عجلت میں لکھا ہوگا لیکن خوب لکھا ہے البتہ نام کا مسئلہ آ گیا ہے۔ وہ ایڈورڈ سیڈ لکھتے ہیں، بی بی سی والوں نے ایڈورڈ سعید کا نام دیا تھا، شاید تونسوی صاحب ٹھیک ہوں گے۔ خالد سعید، اوریانہ فلاشی کے ناول کا ترجمہ خوب کر رہے ہیں مگر پتہ نہیں چلتا کہ ترجمہ کے لیے انہوں نے یہ ناول کیوں منتخب کیا اور کیا وہ اچھا سا عنوان نہ چن سکتے تھے۔ مزید عرض کر دوں کہ اس شمارے میں شامل شاعری بالکل پسند نہیں آئی۔ یہی شاعری ہے تو۔۔۔

(قاضی جاوید۔ لاہور)

''انگارے'' (۱۰ ویں کتاب) نظر نواز ہوا۔ عنایت کے لیے بہت ممنون ہوں۔ میں نے محسوس کیا ہے کہ بعض غور طلب باتوں میں ''انگارے'' کے قارئین دلچسپی نہیں لیتے مثلاً جب محترم حمایت علی شاعر کا خط اردو زبان پر پاکستان کے حوالے سے شائع ہوا تو کسی نے بھی کوئی توجہ نہیں دی۔ سوائے میرے اور پھر میرے خط پر بھی بعد کے شمارے میں صرف جناب سجاد مرزا نے ایک سطر لکھی تھی کہ وہ میرے موقف کو درست سمجھتے ہیں۔

اب دو شماروں کے بعد محترم حمایت علی شاعر نے پھر اِس موضوع پر ایک طویل خط لکھا ہے اور زور دیا ہے کہ ہمیں زبان کے معاملے میں ہندوستان کی نقل کرنا چاہیے۔ شاید وہ اپنے پہلے خط کے مکمل طور پر نظر انداز کیے جانے کے بعد مزید خامہ فرسائی نہ کرتے مگر انہیں میری لکھی باتوں کو ''بچگانہ'' قرار دینا تھا

پھر زحمت کی۔ وہ میرے بزرگ ہیں جو میرے بارے میں جو چاہیں کہہ سکتے ہیں۔ بے شک ان کی بزرگانہ سوگفتگو کے سامنے میری باتیں بچگانہ ہی ہوں گی۔ یہ بھی درست کہ ایک ترقی پسند شاعر ہونے کے ناتے ملک اور قوم کے مسائل کا جو شعور انہیں حاصل ہے۔ وہ جدیدیت سے وابستہ ہونے والوں کے نصیب میں نہیں کہ بقول ان کے اس پر بڑی بحثیں ہو چکی ہیں (معلوم نہیں ان بحثوں کا نتیجہ کیا رہا؟ اغلباً ترقی پسند ہی غالب رہے ہوں گے)۔

میں اب اس موضوع پر کچھ لکھنا نہیں چاہتا جو کہنا تھا میں نے اپنے پچھلے خط میں لکھ دیا تھا۔ اس وقت پاکستان کے ہر صوبے کی سرکاری زبان وہی ہے۔ جو انہوں نے خود opt کی تھی۔ اب اگر میں کہوں کہ اس سے ہٹ کر ہے تجویز تفرقہ ڈالنے کی کوشش کے سوا کچھ اور نہیں تو کیا غلط ہوگا؟

محترم شاعر صاحب کے اس خط سے ایک بات واضح طور پر سامنے آتی ہے کہ شاعر صاحب ایک خاص طبقے کو پاکستان میں اردو کی ''آمرانہ روش'' کا ذمہ دار سمجھتے ہیں اور شاید وہ اسی طبقے کو جسے انہوں نے ''ہم لوگ'' کہا ہے وہ سنگِ راہ سمجھتے ہیں جس نے پاکستان کی علاقائی زبانوں کو سرکاری اور لازمی زبان بننے سے روکا ہوا ہے۔ ان کے خط میں اِسی طبقے (ہم لوگ) کی وضاحت موجود ہے یعنی وہ طبقہ جس کی مادری زبان اردو ہے۔ جو باہر سے آ کر یہاں آباد ہوا ہے۔ جس میں رئیس امروہوی شامل تھے اور جس میں خود حمایت علی شاعر صاحب بھی شامل ہیں۔ حالانکہ یہ لوگ ملک کی کل آبادی کا دس فیصد بھی نہیں ہیں ان پر تو اگر چینی زبان بھی بحیثیت سرکاری اور لازمی زبان مسلط کر دی جائے تو یہ بے چارے چینی بھی نہیں بول سکتے چہ جائے کہ یہ پورے ملک میں اپنی ''قوت'' سے کوئی زبان مسلط کر سکیں___ تو یہ ہے ہمارے بزرگ کا ملکی مسائل کا شعور۔

سبھی جانتے ہیں ایسا نہیں ہے۔ اردو اِس محدود طبقے کی قوت سے ملک کی قومی یا سرکاری زبان نہیں بنی ہے۔ یہاں کا ایک بہت بڑا صوبہ پنجاب ہمیشہ سے دلی اور لکھنو کی طرح اردو کا ایک ''دبستان'' رہا ہے اور تو اور اردو تو قبائلی علاقوں تک کی پسندیدہ زبان رہی ہے۔ ایسا نہ ہوتا تو صوبہ سرحد اور صوبہ بلوچستان کیوں اور کس کے خوف سے اپنی مادری زبانوں کے بجائے اردو کو اپنی سرکاری زبان کے طور پر opt کرتے؟ شاعر صاحب اِس بات کا جواب ضرور دیں، وہ یہ بھی بتائیں کہ وہ ''ماں کے دودھ میں بڑی طاقت ہوتی ہے'' جیسے جملے لکھ کر آخر اذہان کو کس طرف موڑنا چاہتے ہیں؟ جب کہ انہوں نے اپنے خط میں خود بھی تسلیم کیا ہے کہ ''پشتو'' بھی اپنے علاقے کو اردو کی ماں سے تعبیر کرتے ہیں۔ وہ یہ بھی بتائیں کہ ان کے خط کے اِس جملے میں پاکستانی حکمرانوں نے طاقت کے بل پر خود غرضی کے جو مظاہرے کئے کم از کم دانش وروں کو ان کا ساتھ نہیں دینا چاہیے) جن حکمرانوں کی سمت اشارہ کیا گیا ہے وہ کون ہیں؟ وہ پاکستانی تھے یا مریخ کے متوطن؟ اور کیا یہ سب کے سب اسی طبقے کے تھے جنہیں محترم حمایت علی شاعر نے ''ہم لوگ'' کہا ہے اور جسے انہوں نے ملک میں اردو کی آمرانہ روش کا ذمہ دار قرار دیا ہے؟ یہ سوال میں نے صرف اس لیے کیا ہے کہ ان حکمرانوں کا ذکر انہوں نے اردو کے حوالے سے کیا ہے۔

اردو کو انہوں نے سندھی زبان کا لفظ کہا ہے۔ اسی سلسلے میں ماہنامہ ''شب خون'' الہ آباد کے ایک شمارے میں شمس الرحمان فاروقی صاحب کا ایک مضمون چھپا ہے جس میں انہوں نے اردو ''اردو کے رسم الخط'' اور ہندوستان میں اس کی صورت حال پر بڑی شرح وبسط کے ساتھ لکھا ہے۔ شمس الرحمان صاحب نے اس کے معنی ''بادشاہ کا کیمپ'' لکھا ہے۔ میں شاعر صاحب کے علم کو چیلنج نہیں کر سکتا مگر فاروقی صاحب کی علمی حیثیت سے سبھی واقف ہیں۔

حمایت علی شاعر صاحب نے اپنے خط میں لکھا ہے: ''فارسی کی صحبت میں اردو کا دماغ خراب ہو گیا۔ اس نے سرکاری زبان کا لباس پہن کر خود کو اوپر کے طبقے میں پہنچا دیا اور عوام کو بھول گئی۔ یہی وجہ ہے کہ اس کا کوئی لوک ادب نہیں۔''

ان جملوں میں کچھ اور ہو کہ نہ ہو صاف نظر آتا ہے کہ محترم شاعر صاحب ''اردو'' سے کچھ متنفر سے ہیں۔ حالانکہ اردو کے بغیر خود ان کا تمام کلام بلاغت نظام کہیں کا نہیں رہے گا۔ مندرجہ بالا پیرے میں انہوں نے اردو کو سرکاری زبان کا لباس پہنا دیا ہے لیکن کیا طرفہ تماشا ہے اسی خط میں انہوں نے لکھا ہے کہ اردو آج تک پاکستان کی سرکاری زبان نہیں بن سکی ہے۔ اِسی طرح ایک جگہ وہ لکھتے ہیں کہ ''زبان دلوں میں راہ پیدا کرتی ہے'' اور دوسری جگہ ایسی باتیں لکھی ہیں جس سے معلوم ہوتا ہے کہ زبانیں اپنی صحبت سے دوسری زبانوں کا دماغ خراب کر دیتی ہیں۔ وہ ہمیں بتائیں آخر وہ یہ سب کیا لکھ رہے ہیں؟ کہیں ایسا تو نہیں کہ عمر کے ایک خاص حصے میں پہنچ کر جو انتشاری کیفیت شعور میں در آتی ہے یہ اسی کا نتیجہ ہے؟ میری ان سے گزارش ہے کہ وہ جو کچھ جیسا ہے رہنے دیں۔ آنے والی نسل کو زبانوں کے سوا بھی بہت کچھ سیکھنا ہے۔ ان کے دماغ شاعر صاحب جیسے بزرگوں کے دماغ کے برابر شعور نہیں رکھتے۔ وہ اپنی دماغی گنجائش کے مطابق جو بہتر سمجھیں گے کر لیں گے۔ بہتر ہوگا کہ ''کچھ مفید باتیں لکھیں جیسی ایک بات ''انگارے'' کے مدیر عامر سہیل نے لکھی ہے یعنی کسی سرکاری دار الترجمہ کا قیام وغیرہ۔

ڈاکٹر معین الدین عقیل کا مضمون اچھا ہے مگر تنقیدی کسی طرح نہیں۔ اسے تقریظی مضامین کے ایک نمونے کی طرح پیش کیا جا سکتا ہے۔ احمد ندیم تونسوی نے حال میں انتقال کرنے والے ایڈورڈ سڈ کا (یا سعید) مختصر تعارف عمدگی سے لکھا ہے۔ اسی طرح فرزانہ پروین کا مضمون بھی معلوماتی ہے۔ راشد پر اب خواہ کچھ بھی لکھا جائے ان کے شعری قد وقامت میں کوئی فرق نہیں ڈالا جا سکتا۔

آپ نے افضل گوہر کی متعدد غزلیں مع تعارف شائع کر کے اچھا کام کیا ہے۔ یہ انفرادی مطالعہ کے ضمن میں آتا ہے اور قارئین کو ان کے فکر وفن سے متعارف ہونے میں لا دینے والا ہے۔ خالد ریاض خالد اور آپ کی نظم سے نظموں کا حصہ اتنا دھندلا نہیں رہا ہے۔ غزلوں میں فہیم شناس اور پرویز ساحر کے چند شعر اچھے لگے۔ خطوط کے حصے میں، ابن حسن صاحب کا خط میرے خیال میں ایک مضمون کی طرح شائع کیا جا سکتا تھا۔ میری غزل کے ایک شعر میں کتابت کی غلطی نے کچھ گڑبڑ پیدا کر دی ہے۔ شعر چھپا ہے

نہیں رہی ہے وہ شے مجھ میں جو بڑی ہوئی تھی
نکل کے مجھ سے وہ کیا جانے کیا گھٹا گیا ہے

اس کے پہلے مصرع میں ''بڑھی'' کے بجائے ''بڑی'' لکھا گیا ہے جو غلط ہے۔ شعر درست شکل میں یوں ہے:

نہیں رہی ہے وہ شے مجھ میں جو بڑھی ہوئی تھی
نکل کے مجھ سے وہ کیا جانے کیا گھٹا گیا ہے

(احمد صغیر صدیقی۔ کراچی)

کل ''انگارے'' کا اکتوبر کا شمارہ ملا تھا۔ فرصت میں پڑھنے کا موقع ملا۔ ماشاءاللہ کیا مواد ہے اور کیا رنگ ہے ایسے شماروں کی اشاعت پر دلی مبارک باد پیش کرتا ہوں۔

محترم ڈاکٹر معین الدین عقیل صاحب کا مضمون، افضل گوہر کی غزلیں اور ابنِ حسن کا خط بہت ہی خوبصورت اور معلوماتی لگے اور میں ان تینوں کا مزید مداح ہو گیا ہوں۔ حمایت علی شاعر صاحب کا مضمون بہت زبردست ہے۔

(ڈاکٹر سعید اقبال سعدی۔ گوجرانوالہ)

''انگارے'' کی دسویں کتاب میرے سامنے ہے۔ ''چند باتیں'' آپ کی تحریر متاثر کرتی ہے اور دعوتِ فکر دیتی ہے۔ تمام مضامین جاندار ہیں۔ افضل گوہر کی غزلیں قابلِ داد ہیں۔ لیاقت علی کی کہانی بھی خوب ہے۔ سلسلہ وار ناول ''ایک مرد'' اچھا جا رہا ہے۔

شاعری میں فہیم شناس کاظمی، احمد صغیر صدیقی اور شانی فریاد کی شاعری دل کو لگتی ہے۔ حمایت علی شاعر کا خط قابلِ ذکر ہے۔ آپ کی محنت اور لگن سے یہ ثابت ہوا کہ ''انگارے'' ترقی پسند ادب کا ترجمان ہے۔ اللہ آپ کو خوش رکھے، دوست احباب کے لیے سلام۔

(خالد ریاض خالد۔ ملتان)

''انگارے'' کی دسویں کتاب اپنے اندرون عمدہ شعری و نثری مواد لیے، نظر نواز ہوئی۔ چند باتیں، کے عنوان سے اداریہ عمدہ تھا۔ ہم ان سے بالکل متفق ہیں کہ حکومتی سرپرستی میں ایک بڑے ''دارالترجمہ'' کی تشکیل دی جائے۔ معین الدین عقیل کا تنقیدی مقالہ انتہائی جامع اور مدلل تھا، واقعی نصیر ترابی منفرد اسلوب کے عمدہ شاعر ہیں۔ ڈاکٹر صاحب نے جس انداز سے نصیر ترابی کی شاعری کے فنی و فکری پہلوؤں کی نشان دہی کی وہ قابلِ صد ستائش ہے۔ ن۔م۔ راشد کی اہم نظم ''حسن کوزہ گر'' کے حوالے سے زرغونہ کنول کا تجزیاتی مطالعہ، بھی پسند آیا۔ غزلوں میں احمد صغیر صدیقی، افضل گوہر (تین غزلیں)، فہیم شناس کاظمی کی غزلیں فکری و فنی لحاظ سے عمدہ تھیں۔ نظموں میں ڈاکٹر خیال امروہوی، احمد صغیر صدیقی، سید عامر سہیل اور شانی فریاد کی نظمیں بہت جاندار تھیں۔ خطوط کا حصہ کسی بھی ادبی رسالے یا

پرچے میں بہت خصوصیت کا حامل ہوتا ہے۔ حالیہ شمارے میں حمایت علی شاعر، احمد صغیر صدیقی، ابنِ حسن اور ڈاکٹر صابر کلوروی کے مکتوبات علم افروز تھے۔ علمی مباحث کی اشد ضرورت ہے ادب کو۔ یقیناً یہ پرچہ اِس کمی کو پورا کر رہا ہے دیگر مضامین اور افسانے ہنوز زیرِ مطالعہ ہیں۔

(پرویز ساحر۔ ایبٹ آباد)

''انگارے'' شمارہ نمبر ۱۰ موصول ہوا۔ چند باتیں کے تحت آپ نے ایک بڑے ''دارالترجمہ'' کے قیام کی جس خواہش کا اظہار کیا ہے۔ خدا کرے یہ خواہش پوری ہو جائے۔ (ویسے اس خواہش کے پوری ہونے کی امید تو درکنار اس سے متعلق حکومتی سطح پر سوچ بچار کا سلسلہ شروع ہونے کی بھی توقع نہیں ہے)۔

اپنی دو غزلیں ''انگارے'' کے لیے ارسال کر رہا ہوں۔

(قاضی عطاء الرحمٰن۔ عارف والا)

''انگارے'' اکتوبر کا ۲۰۰۳ء شمارہ موصول ہوا۔ گزشتہ شماروں کی طرح یہ شمارہ بھی رنگا رنگ تحریروں سے مزین ہے۔ ڈاکٹر معین الدین عقیل کا مضمون ''نئی غزل کا نیا لہجہ'' تفصیلی اور پر مغز تھا۔ اس میں انہوں نے نصیر ترابی کے شعری مجموعہ جو ''عکسِ فریادی'' ہے اس کو سامنے رکھتے ہوئے غزل کا داخلی اور خارجی آہنگ بڑی خوش اسلوبی سے بیان کیا ہے۔

شخصیت کے حوالے سے ''ایڈورڈ سیڈ'' احمد ندیم تونسوی کا مضمون بہت خوب تھا۔ اسے پڑھ کر ہماری ایک ایسے دانشور سے ملاقات ہوئی جس نے مغرب میں رہتے ہوئے مشرق والوں کو سمجھنے اور جاننے کا کس قدر ہمدردی کا خواہاں ہے۔ احمد ندیم تونسوی نے نہایت مختصر طریقے سے ہمیں ایڈورڈ سیڈ کی تخلیقی حیثیت سے آگاہ کیا ہے۔

فرزانہ پروین کا مضمون گراہم بیلی کی تصنیف ''تاریخ ادب اردو'' نہایت عمدہ ہے۔ اسی طرح زرغونہ کنول کا مضمون ''حسن کوزہ گر۔ ایک تجزیاتی مطالعہ'' بہت جاندار اور تفصیلی تھا۔

لیاقت علی کی تحریر ''ٹرائی اینگل'' مختصر اور جاندار کہانی تھی۔ نمائندہ غزل گو شاعر افضل گوہر کی آٹھ غزلیں انسان کے ملے جلے جذبات کی عکاسی کرتی تھیں۔ ہمیشہ کی طرح شاعری کے گوشے نے انسان کی ذہنی تھکان دُور کر دی ہے۔

(واصفہ جبیں۔ جام پور)

رسید اور اطلاع:

محمد سلیم الرحمٰن (لاہور) افتخار عارف (اسلام آباد) غلام حسین ساجد (لاہور) ابنِ حسن (گوجرانوالہ) ناصر حسین بخاری (اسلام آباد) ایم خالد فیاض (گجرات) شوکت راز (سرگودھا) طیّب بیداری (میلسی) منیر کھوکھر (گوجرانوالہ) خالد سنجرانی (لاہور) حبیب اللہ (گوجرانوالہ) خالد شریف (گوجرانوالہ) خالد سلیم (گوجرانوالہ) صفدر علی شاہ (سرگودھا) محمد کاشف (گوجرانوالہ) پروفیسر امتیاز حسین (گوجرانوالہ)